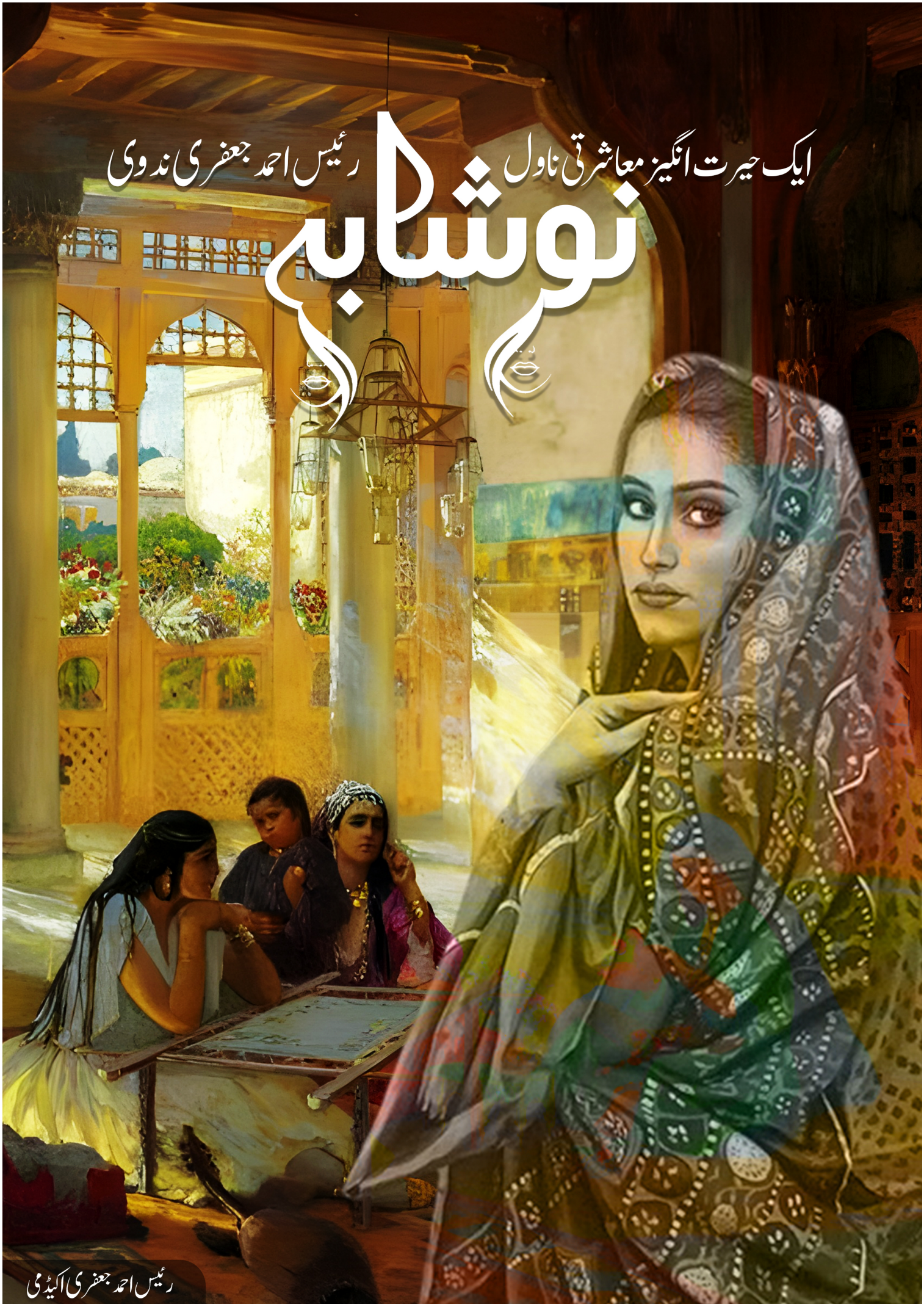

ایک حیرت انگیز معاشرتی ناول
رئیس احمد جعفری ندوی
نوشابہ
رئیس احمد جعفری اکیڈمی

# نوشابہ

ایک عبرت انگیز معاشرتی ناول

رئیس احمد جعفری

مکتبہ ذوق سلیم۔ چوڑیوالان۔ دہلی

# یہ دنیا!

اس دنیا میں خوشیاں کم ہیں مصیبتیں زیادہ، آہیں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔
مسرت کے ترانے مشکل سے سنائی دیتے ہیں۔ آنسوؤں کی برکھا ہوتی ہے۔
اور ہوتی رہتی ہے۔ لیکن نشاط کے پھول بڑی مشکل سے۔۔۔ اور بڑی دیر میں
کھلتے ہیں۔ حادثے قدم قدم پر، صبح سے شام تک ہر کسی کو موجود رہتے ہیں
لیکن ملک کی دنیا میں، جنگ، ترنگ اور دل دہلا دینے کرنے کے واقعات شاذ و
نادر ہی رونما ہوتے رہتے ہیں۔ خاص طور سے ان لوگوں کے ساتھ جن
کا مقدر روٹھ چکا ہے، جن کے سہارا نہیں۔ جن کا کوئی مددگار اور پالن
ہار نہیں ہے۔
لیکن۔۔۔۔۔

rekhta


طبع اول ۱۹۶۷ء

تعداد ۷۰۰

ناشر اشتیاق احمد

مطبع ہندوستان پرنٹنگ پریس، دہلی

قیمت چھ روپے


rekhta

لیکن......

لیکن جو قدرت کی طرف سے طبع سلیم لے کر آتے ہیں وہ ہر حالت میں ہر صورت میں اپنے آپ کو بناتے اور سنوارتے رہتے ہیں کوئی حادثہ ان کی محبت نہیں چھین سکتا کوئی سانحہ ان کے دلولے سرد نہیں کر سکتا۔ وہ دنیا سے لڑتے ہیں قدرت سے جنگ کرتے ہیں، مخالف حالات سے نبرد آزما ہوتے ہیں، دوستوں کی دشمنی، عزیزوں کی دشمنی، ساتھیوں کی دشمنی سب کی دشمنی دیکھتے ہیں مگر پرواہ نہیں کرتے۔ میدان میں ڈٹے رہتے ہیں اور بالآخر کامیاب ہوتے ہیں"

اس ناول میں ایسی ہی کہانی بیان کی گئی ہے...... جس میں آنسو بھی ہیں اور قہقہے بھی، ناکامی بھی اور کامیابی بھی"

# انتساب :-

نومبر ۱۹۶۰ء میں دہلی گیا، تو میرے وہاں پہنچنے سے پہلے میری آمد کی خبر گرم ہو چکی تھی۔ جانے کے بعد اردو بازار کی ہر دکان ادب سے معلوم ہوا ایک صاحب جوش ن ملی کئی روز سے میری تلاش میں سرگرم ہیں جب مجھے کوئی اہمیت نہ دی اور چند روز بعد لکھنؤ چلا گیا۔

لکھنؤ پہنچا تو دارالعلوم ندوۃ العلما کے مہتمم کے نام ان کا ایک مکتوب پہنچا کہ دہلی آؤں تو ملاقات کا ضرور موقع دوں، پھر دہلی پہنچا مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ لاہور واپس آیا تو جوش صاحب کا خط ملا جس میں داستان ملاقات کے بعد لکھا گیا کہ انہوں نے میرے ناول "کشمکش" کا ہندی میں ترجمہ کر لیا ہے۔ بعض دوسرے ناولوں کا ترجمہ کرنے والے ہیں۔ لیکن میری بلا اجازت انہیں رائلٹی دیئے بغیر چھاپنا چاہتے ساتھ ہی ساتھ ایک ایگریمنٹ کا مسودہ بھی ملک کمپنی کی طرف سے :

میرا ہر ناول دہلی اور لکھنؤ کے پبلشر بغیر میری اجازت کے چھاپ چکے ہیں رائلٹی یا معاوضہ یعنی بعید از عقل چیز ہے کہ اسے وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ اجارہ دار پبلشر مذہب کے اعتبار سے ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔

ان حالات میں ہندی کی ایک پبلشنگ فرم کی طرف سے ہندی ترجمہ کی رائلٹی دینے کا عزم اور ایک ہندی ادیب کا "اجازت" لے کر ترجمہ کرنا میرے جذبات پر کچھ اس طرح اثر انداز ہوا کہ میں اس کتاب کا انتساب جوش ن ملی کے نام کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں ... ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں!

رئیس احمد جعفری

# دلاور منزل

ڈاکٹر دلاور حسین شہر کے ممتاز ڈاکٹروں میں تھے۔ غریب گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ آدمی ذہین اور محنتی تھے۔ ہر طرح کی مشکلات کے باوجود امتیاز کے ساتھ میڈیکل کالج سے ڈگری لی۔ پریکٹس شروع کر دی۔ قابل بھی تھے اور ہمدرد بھی، بہت جلد طوطی بولنے لگا۔ شروع میں سو روپے مہینہ بھی مشکل سے کماتے تھے۔ اب سینکڑوں روپے روز کی آمدنی ہے۔ صبح سے شام تک مریضوں کا تانتا لگا رہتا ہے، اور ڈاکٹر صاحب کو سر اٹھانے کی مہلت نہ ملتی، دھن برس رہا تھا گھر میں!

ڈاکٹر صاحب کی اس کامیابی اور عروج کا سبب حسینہ بیگم اپنے آپ کو ٹھہراتی تھیں۔ جب انھوں نے اس گھر میں قدم رنجہ نہیں فرمایا تھا۔ کہنے کو رہا کرتے تھے یہاں، خاک زندگی تھی اس گھر میں۔ جس دن سے وہ دلہن بن کر آئیں، حالات بدل گئے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی بیوی کی یہ تعلّی سنتے



اور مسکرا کر خاموش ہو جاتے۔ بلکہ گردن ہلا ہلا کر تائید کیا کرتے تھے، اور عملی تائید یوں کرتے کہ شام کو ساری آمدنی بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیتے۔ وہ سیاہ و سفید کی مالک تھیں۔ جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ کوئی باز پرس کرنے والا اور حساب طلب کرنے والا نہ تھا۔

اس گھر میں ایک ننھی سی گڑیا بھی تھی ....... نوشابہ۔ عمر یہی ہوگی کوئی ۸ — ۹ سال کی۔ گلاب کے پھول کی طرح تر و تازہ، ہنس مکھ خوش مزاج، ماں کی آنکھ کا تارہ، باپ کے دل کا سکون، بچے لاڈ میں بگڑ جاتے ہیں۔ لیکن نوشابہ کا یہ حال تھا کہ جتنے لاڈ ہوتے، اتنی ہی اتنی سیرت نکھرتی تھی۔ تمیز کا یہ حال تھا کہ نوکروں تک کو نہ ستاتی۔ صرف اس کی خدمت کے لئے جو ملازمہ مامور تھی، اگر اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو کبھی ماں سے شکایت نہ کرتی۔ وہ پوچھتیں بھی تو سارا الزام اپنے سر لے لیتی۔ پڑھنے لکھنے، سینے پرونے، اور پکانے ریندھنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ ماسٹر صاحب آئے ہیں، وہ اطمینان سے سبق یاد کر رہی ہے۔ اس سے فرصت ہوئی تو گڑیوں کے کپڑے سینے کی مشق ہو رہی ہے۔ اس سے جی بھرا، تو ہنڈکلیاں پکائی جا رہی ہیں۔ شرارت، اودھم، غل غپاڑہ، مار دھاڑ، توڑ پھوڑ ان چیزوں سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گھر کے سب لوگ اسے دل سے چاہتے تھے۔ ذرا بیمار پڑی تو نوکر بھی اتنے ہی بے قرار ہو جاتے اور مضطرب ہو جاتے جتنے خود ڈاکٹر صاحب یا حسینہ بیگم۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک چھوٹی بہن بھی تھیں۔ حمیدہ بیگم۔ ڈاکٹر صاحب انہیں بہت چاہتے تھے۔ یہ بھی بے حد بھائی پہ فدا تھیں۔ ان کے شوہر ایک اچھے سرکاری عہدے پر مامور تھے۔ اور تبادلے کے سلسلے

میں مختلف شہروں کی سیر کیا کرتے تھے۔ آج یہاں ہیں تو کل وہاں میں حمیدہ بیگم بھی شوہر کے ساتھ جہاں گردی ہوئی تھیں تبھی تو سال بھر میں ایک پھیرا بھائی کے گھر کا ضرور کر لیتی تھیں لیکن تو کبھی روز پہلے قاسم میاں (حمیدہ کے شوہر) بیوی کے فراق میں ہر کے گھنٹے خطوں اور تاروں کا تانتا باندھ دیتے "کہ فوراً آؤ ورنہ غم فراق میری جان پر بنا دے گی" لیکن حسینہ بیگم کا اصرار اور ڈاکٹر صاحب کا حکم ٹالا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

جب آجاتی تھیں تو دو مہینوں سے پہلے کسی طرح واپس جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ نوشابہ ان سے بہت محبت کرتی تھی اور وہ بھی نوشابہ پہ جان چھڑکتی تھیں جانے وقت زیادہ تر ایسا محسوس ہوتا کہ ماں کی شہ اور باپ کا اشارہ پا کر وہ حمیدہ بیگم کے دامن سے لپٹ جاتی اور بڑے معصوم لہجہ میں اصرار کرتی۔

"اچھی پھوپھی جان ابھی نہ جائیے۔ بس ایک ہفتہ کے بعد چلی جائیے گا۔"

پھوپی جان لاکھ لاکھ بہلانے پھسلانے کی کوشش کرتیں لیکن بچے جن کہاں قبضے میں آتے ہیں، پھر وہ اپنا آخری حربہ استعمال کرتی، یعنی رونا شروع کر دیتی، اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتی کہ بے حال کر دیتی اپنے آپ کو۔ حسینہ بیگم کو موقع مل جاتا۔ وہ طنز کا تیر پھینکتیں۔

"چپ رہو بی نوشابہ، پھوپی جان ویسے تو بڑی محبت کرتی ہیں، لیکن تمہارا کہا نہیں مان سکتیں۔ ایک ہفتے کے لئے بھی نہیں رک سکتیں"

قبل اس کے کہ حمیدہ بیگم اپنی چہیتی بھاوج کے اس وار سے سنبھلتیں چہیتا بھائی۔ تیر چلا دیتا:



"بڑی ظالم ہو حمیدہ، ننھی سی بچی کے رونے پر بھی ترس نہیں آتا تمہیں!"

حمیدہ بیگم مسکرا کے رہ گئیں۔ بندھا ہوا بستر پھر کھل جاتا اور گھر میں نئے سرے سے بہار آجاتی۔ آج پورے سال بھر بعد وہ بہار اس گھر میں پھر آرہی تھی۔ حمیدہ بیگم کا تار آیا تھا۔ اسی رات کی گاڑی سے پہنچ رہی ہیں۔"

---

# الہ دین کا چراغ

حمیدہ بیگم کے آتے ہی واقعی ولادر منزل میں بہار آگئی۔ سارا دن استقبال کی تیاریوں میں بسر ہوگیا۔ بہت زیادہ جوش اور سرگرمی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس مرتبہ قاسم میاں بھی آرہے تھے، ورنہ اکثر ایسا ہوتا، حمیدہ بیگم اپنے بچے یا ملازمہ کے ساتھ تنہا آتیں اور اسی طرح واپس چلی جاتیں۔ بے چارے قاسم میاں ملازمت کے سلسلے میں ایسے جکڑے تھے کہ لاکھ لاکھ درخواستیں دیتے مگر حکام اعلیٰ کسی طرح چھٹی دینے پر آمادہ نہ ہوتے۔ وہ پولیس میں ملازم تھے اور بدقسمتی سے ایسے فرض شناس، کارگزار، اور دیانت دار آدمی تھے کہ نہ ان کا کوئی نعم البدل ملتا تھا نہ رخصت ملتی تھی۔ لیکن اس مرتبہ قسمت ذرا زور پر تھی۔ سال بھر کے لئے پولیس حکام کی تربیت کا ایک کورس لندن میں شروع ہوا۔ جن حکام پر نگاہ انتخاب پڑی ان میں قاسم میاں بھی تھے۔ سوچا لندن جانے سے پہلے بیوی کو اس



کے گھر پہنچا آئیں۔ اور خود بھی ہفتہ عشرہ ایک عرصہ دراز کے بعد ذرا سالے اور سالی کی مہمان نوازی سے لطف اٹھائیں۔ عزیز داری سے قطع نظر ڈاکٹر دلاور حسین سے ان کے ذاتی مراسم بھی بہت زیادہ تھے۔ دونوں نے ساتھ ساتھ کالج میں تعلیم ختم کی تھی اور اس باہمی اعتماد کا یہ نتیجہ تھا کہ حمیدہ کی شادی ان سے کردی گئی اور خدا کا شکر ہے یہ رشتہ بہت کامیاب رہا۔ حمیدہ اور قاسم کی باہمی محبت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ شروع میں قاسم میاں بھی کچھ یوں ہی سے رہے۔ گھر میں دولت نہ تھی ملازمت عنقا کی طرح نایاب تھی۔ شادی تو شوق میں آکر کرلی۔ لیکن بیوی کا بوجھ اٹھانا آسان تو نہ تھا۔ شاید ہمت ہار دیتے مگر حمیدہ نے بے کاری کے زمانے میں اس طرح شوہر کا حق رفاقت ادا کیا اور اس طرح چپکے چپکے بتائے بغیر اپنے چھوٹے موٹے زیور بیچ کر گھر کا خرچ چلایا اور شوہر کے ٹھاٹھ پورے کئے کہ قاسم میاں کی نظر میں اس کی محبت اور عزت بڑھتی ہی گئی۔ انہوں نے حمیدہ کا دوسرا نام ہی الہ دین کا چراغ رکھ دیا تھا۔ کہا کرتے جب کوئی کام اٹکتا ہے، الہ دین کا چراغ (حمیدہ) فوراً پورا کردیتا ہے۔ یہ تو ملازم ہونے کے کافی عرصہ بعد معلوم ہوا کہ الہ دین صاحبہ اپنا سارا زیور چراغ بننے میں صرف کرچکی ہیں۔ اس کے بعد قاسم کی چاہت اور بڑھ گئی۔ اس کا یہ معمول تھا، تنخواہ لایا اور بیوی کے ہاتھ میں رکھ دی اسے وہ جانے اور گھر۔ دونوں کی شادی کو تیرہ سال کی مدت گزر چکی تھی، مگر کیا مجال ہے جو اس مدت میں ایک مرتبہ بھی تلخی یا شکر رنجی کی نوبت آئی ہو۔"

جیسے ہی گاڑی پلیٹ فارم پر رکی، سب سے پہلے نوشابہ بیگم

طرح ماں، باپ کے گھر سے نکلی اور حمیدہ بیگم سے جا کر لپٹ گئی۔ حمیدہ نے اُسے سینے سے لگایا اور گود میں اٹھایا۔

قاسم میاں نے کہا: "کیوں رئی بے مروت! پھوپی جان ہی سب کچھ ہیں، ہم کچھ نہ ہوئے۔ نہ سلام نہ کلام، اِیں؟"

وہ شرما سی گئی۔ جلدی سے ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا اور پوچھا:

"آپ خیریت سے تو ہیں؟"

قاسم نے پیار کرتے ہوئے کہا:

"بچی! اگر خیریت سے ہوتا تو پاگل خانہ کیوں جاتا؟"

نوشابہ حیرت سے اپنے پھوپا کی طرف دیکھنے لگی۔ قاسم میاں نے حاضرین پر ایک نظر ڈالتے ہوئے نوشابہ سے کہا:

"لندن اور پاگل خانے میں کوئی فرق نہیں ہے!"

حسینہ بیگم ہنسنے لگیں۔ دلاور حسین نے قہقہہ لگایا۔ حمیدہ نے تیوری چڑھا کر کہا:

"موقع ہو یا نہ ہو، بس مذاق سے کام!"

یہ باتیں حمیدہ نے اس طرح [illegible] کہیں کہ قاسم کے سوا کوئی نہ سن پایا۔ لیکن قاسم نے بآوازِ بلند اپنے الفاظ واپس لے کر سارا راز فاش کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر قہقہہ لگایا۔ حسینہ بیگم بھی ہنسنے لگیں،

"بھیا! تمہاری شوخی تو عمر کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ بڑے وہ ہو تم بھی۔"

قاسم نے کہا: "وہ تو ہوں لیکن بُرا نہیں، نہایت خاکسار



اور نیاز مند قسم کا، یقین نہ ہو تو حمیدہ سے پوچھ لیجئے!"

وہ جھینپی ہوئی بولی: "میں نہیں جانتی!"

اتنے میں حسینہ کی نظر گیارہ بارہ سال کے ایک خوبصورت اور نہایت متین و سنجیدہ لڑکے پر پڑی جو ان سب بزرگوں سے الگ ایک گوشہ میں خاموش کھڑا تھا۔ وہ لپکیں اور قاسم کو شکایت آمیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا:

"توبہ ہے، تمہاری باتوں نے ایسا الجھایا کہ شاہد پر نظر ہی نہ پڑی۔ آؤ بھیا آؤ، میرے پاس!"

شاہد آیا اور ادب سے سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ حسینہ بیگم نے دعائیں دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ نوشابہ نے چپکے سے کہا۔

"شاہد بھیا چپ کیوں ہیں، کیا مارا تھا آپ نے؟"

پھر سب لوگ چلنے لگے اور اسی شور و مسرت میں یہ مختصر سا قافلہ موٹر میں بیٹھ کر دلاور منزل روانہ ہو گئے۔

---

# قاسم

قاسم میاں کیا آئے، دلاور منزل میں ایک نئی زندگی آگئی، ایک نئی بہار آگئی۔ ایسی چہل پہل، گہما گہمی اور رونق کبھی اس گھر میں نہیں آئی تھی۔ وہ عجیب و غریب خوبیوں کے حامل تھے۔ جوانوں میں جوان، بوڑھوں میں بوڑھے بچوں میں بچے، دلاور حسین کے پاس بیٹھے تو اس یکسوئی سے میڈیکل ریسرچ سائنسی تحقیقات، بیماریوں اور ان کے معالجات پر گفتگو کرتے کہ وہ محسوس کرتے، صحیح معنوں میں ایک رفیق میسر آگیا ہے۔ جس سے جی بھر کے اپنی کہہ سکتے ہیں اور اس کی سن سکتے ہیں۔ حسینہ بیگم سامنے آجاتیں تو اس طرح کھل مل کر باتیں کرتے "اچھے گھر کے تمام فیصلہ طلب معاملات انہی کے انتظار میں ملتوی ہوتے رہتے ہیں۔ اب یہ آگئے ہیں تو ہر بات پر بحث ہوگی ہر پہلو زیر غور آئے گا۔ اور پھر نہایت اطمینان سے فیصلہ کر لیا جائے گا مثلاً یہ کہ جو بھی کام کرنے کو رہتی ہوگئی ہیں انہیں ختم دے دی جائے



یہ خانساماں "فضول ہے، نمک بہت زیادہ جھونک دیتا ہے! اس پر جرمانہ کیا جائے یہ ملازمہ "تنہ بازی" برتن برے بیلے دھوتی ہے۔ اسے آخری بار تنبیہ کر دی جائے یہ سارے معاملات حسینہ بیگم اور قاسم میاں کی نوک جھونک میں پیش ہوتے اور یہاں سے آخری فیصلہ صادر کر دیا جاتا تھا۔ پھر کس کی مجال تھی کہ اس کے نفاذ میں رکاوٹ بن سکے؟

حسینہ سے رخصت ہو کر حمیدہ کے کمرے میں پہنچے اور اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے:

"یہ لیٹے لیٹے کا کون سا وقت ہے جناب؟"

حمیدہ اٹھ کر بیٹھ گئی "میں تو کتاب پڑھ رہی تھی"

قاسم میاں نے پھر اعتراض کیا:

"سبحان اللہ! کتاب؟ مجھے معلوم تھا کون سا ایسا ضروری کام ہے۔ یہی بے تکی کتابیں پڑھ کر لڑکیاں خراب ہو جاتی ہیں۔"

حمیدہ مسکرائی: "تو میں لڑکی ہوں؟ ذرا سوچ سمجھ کر بات کیا کیجیے۔"

قاسم کے پاس جواب تیار ہوتا: "ہر عورت لڑکی ہی ہوتی ہے اور زندگی بھر لڑکی ہی رہتی ہے۔"

حمیدہ لاجواب ہو گئی "اور نہ آپ سے کون بحث کر سکتا ہے"

قاسم نے پھر چھیڑا: "اگر یہ بات پہلے ہی محسوس کرتیں لڑکیوں پر بھی وقت ضائع ہوتا ..... یہ تو بتاؤ ہمارے لندن جانے کے بعد پروگرام کیا ہوگا تمہارا؟"

حمیدہ نے پوچھا "پروگرام کیسا؟"

قاسم نے کہا: "یعنی سہ پہر جستاں دیکھا جائے گا، ناول پڑھے

جائیں گے باغوں کی سیر ہوگی، دعوتیں اڑیں گی اور خطوں میں یہ لکھا جائے گا۔"
آپ بہت یاد آتے ہیں۔ آپ کے بغیر کسی چیز میں لطف نہیں آتا، زندگی بڑی بے کیف گزر رہی ہے۔ نہ مجھے کوئی چاہتا ہے، نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ دن کتنے سہانے ہنستے گزرتے تھے۔ یہ راتیں ہیں یا قیامت کسی طرح ختم ہونے ہی نہیں آتیں۔ آخر کب آئیں گے آپ؟ آپ کو ہماری قسم بس اب جلدی سے آجائیے پھر آخر میں یہ شعر لکھ دوں گی۔ اگر کا ذرا سے تغیر کے ساتھ۔

"قاسم کو کچھ محبت کا مزا بھول گئے
کیک کو چکھ کے مٹھائی کا مزا بھول گئے"

میں کہتا ہوں جھوٹ۔ بولنے سے کیا فائدہ ....؟"

شاید قاسم کی تقریر ابھی جاری رہتی، لیکن حمیدہ ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی۔ اس نے کہا: "آپ کو کیا ہوگیا ہے، ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں جن کا سر ہے نہ پاؤں؟"

قاسم جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا: "بہت بہتر، یہ باتیں اگر ناگوار ہیں تو بندہ اجازت چاہتا ہے۔"

حمیدہ نوشابہ کے کمرے میں پہنچ گئے جہاں شاہد صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ دونوں میں گھل مل کے باتیں ہو رہی تھیں۔ شاہد اپنا البم لئے بیٹھے تھے اور تصویریں دکھا رہے تھے۔ وہ کوئی سوال کرتی تو جواب دے دیتے۔ قاسم کو دیکھ کر دونوں پھول کی طرح کھل گئے۔ اس لئے کہ وہ بچوں کا بڑا اچھا دوست تھا۔ اس نے آج تک کبھی کسی بچے کو نہ ڈانٹا تھا نہ مارا تھا۔ ہمیشہ خوش رکھتا اور ہنستا ہنساتا رہتا۔ ان ساتھیوں سے اکثر بچوں کو نصیحت کرتا رہتا کہ واحد نسخہ یہ ہے کہ انہیں خوش رکھا جائے، ان کا دل نہ توڑا



جائے۔ اور کوئی شک نہیں اس پر شفقت کامیابی سے وہ عمل پیرا تھا۔ اس نے شاہد کے البم پر ایک نظر ڈالی۔ پھر نوشابہ سے پوچھا:
"کیوں بیٹی، یہ البم دیکھو گی یا سلطانہ ڈاکو کی کہانی سنو گی؟"
"آپ تو سلطانہ ڈاکو کی کہانی سنائیے۔"

قاسم میاں سلطانہ ڈاکو کی کہانی سنانے بیٹھ گئے، سچے اور جھوٹے، اصلی اور فرضی، ایسے ایسے واقعات سنائے کہ نوشابہ دم بخود سنتی رہی۔ شاہد چونکہ اب کی زبان سے اس کہانی کو کئی مرتبہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ سن چکا تھا لہذا صرف پاس ادب سے بیٹھا رہا، ورنہ جی نہیں لگ رہا تھا اس داستان سرائی میں۔ اس کی خواہش تھی کہ کہانی ختم ہو تو وہ پھر اپنا البم سنبھال کے بیٹھے، لیکن یہ کہانی تو شیطان کی آنت کی طرح ختم ہونے ہی نہیں آرہی تھی۔ اتنے میں خودا آیا اور اس نے کہا:
"صاحب اور بیگم صاحب چائے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"
قاسم نے شاہد سے پوچھا: "کیوں بھئی چائے پیو گے یا کہانی سنو گے؟"
شاہد نے اٹھتے ہوئے جواب دیا:
"پہلے چائے پی لوں، پھر کہانی سنوں گا آکر۔"
یہی سوال قاسم نے نوشابہ سے بھی کیا۔ وہ کہنے لگی: "چائے بعد میں دیکھی جائے گی، آپ تو کہانی کہیے۔"
قاسم نے شاہد سے کہا: "تشریف لے جائیے، چائے نوش فرمائیے جا کر ابھی۔ اور نوشابہ کو چھوڑ دیجئے ہمارے حال پر۔"
شاہد مسکراتا ہوا چلا گیا۔ وہاں ڈاکٹر صاحب، حسینہ، حمیدہ سب ہی بیٹھے قاسم کا انتظار کر رہے تھے۔ شاہد کو دیکھ کر حسینہ نے پوچھا:

"اور قاسم بیٹا؟ ..... وہ کہاں رہ گئے؟"

شاہد نے جواب دیا: "سلطانہ ڈاکو کی کہانی سنا رہے ہیں۔ نوشابہ جب تک ختم نہ کریں، وہ تو نہ آئیں گے، نہ نوشابہ کو آنے دیں گے۔"

حسینہ بیگم یہ سن کر مسکرانے لگیں۔ "چڑیلیں! چالاکی ہوں! دیکھوں گی کیسے نہیں آتے ....."

یہاں مزے مزے میں سلطانہ ڈاکو ایک سیٹھ کے محل میں ڈاکہ ڈالنے کے لئے چھت پر چڑھ رہا تھا کہ حسینہ بیگم پہنچیں۔

"میں کہتی ہوں وہاں چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے، موا سلطانہ پھانسی بھی پا گیا اور تم ابھی تک قصے سنے جا رہے ہو! علاوہ بھی انتظار کر رہے ہیں تمہارا ....."

قاسم نے کہا: "ہم تو جناب! صرف نوشابہ بی کے حکم کے پابند ہیں! اسے راضی کر لیجئے، ہم بھی چلتے ہیں، ورنہ یہیں [illegible]۔"

اب حسینہ بیگم نوشابہ سے مخاطب ہوئیں: "اری بی!"

وہ مچل گئی: "کہیں ابھی کہانی سن کر آئیں گے ہم تو!"

حسینہ بیگم کو یہ نقشہ بدلنے میں دیر لگی تو ڈاکٹر صاحب بھی حمیدہ اور شاہد کے ساتھ موقع واردات پر پہنچ گئے۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی؟"

قاسم نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا:

"سلطانہ ڈاکو ڈاکہ ڈال رہا ہے۔ آپ سب لوگ کیوں آ گئے؟ وہ بھاگ جائے گا!"

ڈاکٹر نے قاسم کا بازو پکڑا اور اٹھاتے ہوئے کہا: "بھاگ جانے دو!"



قاسم صاحب مچل گئے: "لیکن ایک شرط سے چلوں گا۔"

ڈاکٹر صاحب نے حیرت اور اشتیاق سے پوچھا: "چائے کے لئے بھی شرطیں عاید کرو گے! اچھا بتاؤ کیا شرط ہے؟"

قاسم نے کہا: "تبادلہ کر لیجئے۔"

اب ڈاکٹر صاحب کے کان کھڑے ہوئے: "تبادلہ کر لوں؟ کس چیز کا تبادلہ کرنا چاہتے ہو تم؟"

قاسم نے نہایت سنجیدگی سے کہا: "آج سے نوشابہ میری لڑکی ہے، شاہد آپ کا لڑکا مانا جائے گا۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا: "وہ تو ہمیشہ سے ہے۔"

قاسم نے کہا: "جی نہیں، آج سے باقاعدہ یہ تبادلہ عمل میں آئے گا۔ شاہد بہت بد ذوق ہے۔ کہانی چھوڑ کر چائے پینے چلا گیا۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ میں اس کے باپ ہونے کا ننگ گوارا کر سکوں۔ نوشابہ میری بچی ہے۔ جیالی کی طرح جمی رہی کہانی سننے کے لئے۔ بس آج سے یہی میری بیٹی ہے۔ شاہد کو میں نے عاق کیا۔ دوسرے یہ کہ مجھے کالا رنگ بھی ناپسند ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا: "رنگ کا سوال کہاں سے پیدا ہو گیا؟"

قاسم نے کہا: "اب بات اٹھی ہے تو بہتر یہ ہے کہ ہر پہلو صاف ہو جائے۔ آپ لوگ دیکھتے ہیں، میرا رنگ کتنا صاف ہے۔ مجھ جیسے گورے شخص کا اتنا کالا بیٹا! اسے تو فخر ہوتا ہوگا کہ میرے باپ اتنے گورے ہیں۔ لیکن مجھے شرم آتی ہے کہ میرا بیٹا اتنا کالا ہے!"

اب حمیدہ سے ضبط نہ ہو سکا: "کالا تو نہیں، ہاں سانولا ضرور ہے لیکن

خوبصورت کتنا ہے!"

قاسم نے کہا: "ہاں خوبصورت ہونے میں کیا شک ہے۔ حضرت یوسف کے بعد بس انہی حضرت کا نمبر ہے۔"

حمیدہ کو غصہ آ گیا۔ "دیکھئے ابا۔ یہ کہنے لگا اسے کچھ، واہ اچھا مذاق ہے۔ ہمارے مجمع میں بیٹھے کے رنگ روپ پر تنقید ہو رہی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا: "حمیدہ تم بھی اس مسخرے کی باتوں کا برا مان گئیں۔ اچھا بھائی قاسم میاں! لو شبانہ آج سے تمہاری بیٹی اور شاہد ہمارا بیٹا ہے۔ کیوں حسینہ منظور ہے یہ تبادلہ؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی: "ہاں مجھے شوق سے اور بڑے فخر سے بھی!"

ڈاکٹر صاحب نے شاہد کا ہاتھ پکڑا اور کہا: "چلو چلیں ہم باپ بیٹے۔ ان باپ بیٹی کو یہیں چھوڑ دو۔"

آگے آگے ڈاکٹر صاحب اور شاہد، پھر حسینہ اور پھر حمیدہ۔

جب یہ لوگ چلے گئے تو قاسم نے ایک سانس میں کہانی ختم کر دی: "ہاں پھر کیا ہوا سلطانہ نے ڈاکہ ڈالا۔ پولیس پہلے سے چھپی کھڑی تھی۔ جیسے ہی نقدی لے کر دوڑا پکڑ لیا گیا۔ عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ پھانسی پا گیا۔ اللہ اللہ خیر صلا ——— اور بیٹی جائیے۔ پلنگ پر جائیے۔ رات کو پھر کہیں ایک نئی کہانی سنائیں گے بڑے مزے کی۔"

---



## لڑائی

قاسم کی وجہ سے گھر میں بڑی رونق تھی۔ سب ہی اس سے محبت کرتے تھے اور وہ خود بھی سب کو اپنی محبت کے دام میں پھانسے رہتا تھا۔ ہوائی اڈے تک سارا گھر اسے رخصت کرنے آیا۔ جب طیارہ اڑا تو شبانہ کی روتے روتے ہچکیاں بند گئیں۔ وہ ضد بھی کہ لندن جائے گی۔ حسینہ بیگم کی التجائیں، ڈاکٹر صاحب کی دھمکیاں، شاہد کی دوستی، حمیدہ کا پیار کسی چیز نے بھی نہ بہلایا۔ روتی ہی رہی۔ لیکن اس کا گریہ، فلک فرسا قاسم میاں کے طیارے تک نہ پہنچ سکا۔ وہ بہت دور اور بہت آگے نکل چکے تھے۔

گھر آنے کے بعد ایک عجیب طرح کی افسردگی سی طاری ہو گئی سب پر، شبانہ کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ حمیدہ کا دل خاص طور پر ڈانواں ڈول تھا۔ بھائی اور بھاوج کی موجودگی میں اس نے اپنے آنسو روک لئے لیکن دل کا اضطرار نزدیک تھے۔ مزاج کے اعتبار سے نرم رہی تھی۔ طیارہ کا نام سن کر دل لرز

جاتا۔ کتنا زور دیا تھا اس نے قاسم پر کہ ہوائی سفر نہ کرے۔ پانی کے جہاز سے جائے لیکن بقول ڈاکٹر صاحب کے وہ مسخرہ ان باتوں کی کب پروا کرتا تھا۔ دل سے بھی بھولی باتوں کا جواب صرف ایک قہقہہ تھا۔ حمیدہ اگر قاسم کی کسی چیز سے چڑتی تھی تو وہ بھی بے موقع اور بکثرت قہقہے تھے لیکن نہ جانے ان قہقہوں میں کیا اثر تھا کہ آخر ان کے شور میں وہ خود بھی مسکرانے لگتی۔ قاسم اپنے ساتھ قہقہے بھی لیتا گیا تھا۔ حمیدہ کا دل اس وقت تک دھڑکتا رہا جب تک لندن سے بخیریت پہنچ جانے کا تار نہ آگیا۔

یوں تو پہلے بھی نوشابہ کو حمیدہ سے اور حمیدہ کو نوشابہ سے لگاؤ تھا۔ لیکن قاسم کے لندن جانے کے بعد یہ لگاؤ غیر معمولی محبت میں اور تعلق خاطر میں تبدیل ہو گیا۔ پڑھنے لکھنے سے جیسے ہی فرصت ملتی وہ تیر کی طرح سیدھی حمیدہ کے کمرے میں پہنچتی۔ حمیدہ بھی بس اس کے انتظار میں بیٹھی رہتی، جیسے ہی وہ آتی لپک کر کھینچ کر کلیجہ سے لگا لیتی۔ پھر اس کی منھی منھی بھولی بھولی اور پیاری پیاری باتیں سنتی، پھر اس کا دل بہلانے اور اسے خوش کرنے کے لئے اپنی طرف سے گھڑ گھڑ کر نئے نئے قصے سناتی۔ قاسم میاں اس کو کہانی کا ایسا چسکا لگا گئے تھے کہ شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ اور اس جنون کی تسکین بس حمیدہ کے دامن سے ہی ملتی تھی۔

حسینہ بیگم ویسے تھیں تو خاصی تیکھے مزاج کی! لیکن حمیدہ کا جہاں تک تعلق تھا۔ اس سے ایک بہن کی طرح محبت کرتی تھیں۔ کہیں دعوت میں جانا ہو، سینما کا پروگرام ہو، کسی تقریب میں شرکت کا ارادہ ہو، باغ کی سیر، چمن کی گلگشت، دل افروز مناظر کا نظارہ کوئی پروگرام بھی ہو، اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا تھا جب تک حمیدہ ساتھ نہ ہو۔ حمیدہ ذرا خاموش



تھی۔ گھر کے چہچہوں اور قہقہوں میں کم شرکت کرتی۔ قاسم کے جانے کے بعد سے تو ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔

گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

بظاہر لوگوں سے باتیں کرتی ہنستی، دلچسپیوں میں شریک رہتی لیکن حقیقتاً کسی چیز سے کوئی لگاؤ نہ تھا بس قاسم کی یاد، اس کے خطوں کا مطالعہ، اسے لمبے لمبے خط لکھنا اور جلد سے جلد واپس آنے کی تاکید کرنا یا پھر اس کی گڑیا جیسی بچی "نوشابہ" کی ضدیں پوری کرنا، کہانیاں سنانا اس سے باتیں کرنا، اس کی باتیں سننا۔ بس یہی مشغلہ تھا حمیدہ کا۔

ایک روز حسینہ اور حمیدہ میں زور کی لڑائی ہو گئی۔

ہوا یہ کہ نوشابہ نے شاہد کی عدم موجودگی میں اس کا البم اٹھا ڈالا یعنی تصویریں نوچ لیں! کچھ کی مرمت کر دی، کچھ پر روشنائی سے اصلاح کر دی۔ یعنی حلیہ اور چہرہ بگاڑ دیا اور بدقسمتی سے عین ارتکاب جرم کے وقت گرفتاری عمل میں آگئی یعنی نوشابہ اپنے مشغلہ میں پورے انہماک سے مصروف تھی کہ شاہد آگیا۔ آخر لڑکا ہی تھا، اپنے شوق کو یوں مٹتا ہوا اور برباد ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ پھول سے گال پر ایک چانٹا جڑ دیا۔ چانٹے کا پڑنا تھا کہ قیامت آگئی۔ دوپہر کا وقت تھا اور ابھی حمیدہ کی آنکھ جھپکی تھی۔ لیکن نوشابہ کے گریہ بے اختیار کی آواز جیسے ہی کان میں پہنچی، ننگے پاؤں دھم دھم کرتی شاہد کے کمرے میں پہنچی یہاں مجرم کی طرح شاہد صاحب خاموش کھڑے تھے اور نوشابہ طرح طرح کے نغمے ایجاد کر رہی تھی۔ حمیدہ نے گھور کر شاہد کو دیکھا۔ پھر لپک کر نوشابہ کو گود میں اٹھا لیا اور پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہوا میری بچی! ـــ کیا شاہد نے تجھے مارا"

رونا اتنا ضروری تھا کہ اس میں کسی طرح کا خلل پیدا کرنا، ایک لمحہ کے لئے بھی، نوشابہ کو منظور نہ تھا۔ اس نے روتے روتے اقرار میں گردن ہلادی

حمیدہ نے شاہد سے پوچھا۔

"کیوں مارا تو نے؟"

صورتِ حال کی نزاکت کا شاہد کو پوری طرح احساس ہو چکا تھا۔ آنے والے خطرہ کے احساس نے اس کی آنکھیں بھی پُرنم کر دی تھیں۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور انگلی سے البم کی طرف اشارہ کر دیا۔ گویا وہ بتا رہا تھا: یہ نوشابہ قاتل ہے۔ اس کے ہاتھ میرے البم کے خونِ ناحق سے رنگین ہیں۔ اس البم کو اچھی اچھی تصویروں سے مزین کرنے میں خود حمیدہ کا حصہ شاہد سے کم نہ تھا۔ اس کا یہ حالِ زار دیکھ کر صدمہ تو ضرور ہوا لیکن اس کیفیت پر غالب آتے ہوئے اس نے غصہ کے لہجہ میں پوچھا۔

"وہ تو بچی ہے۔ البم میں آگ بھی لگا دی ہوتی تو کوئی بات نہ تھی، مگر تیری یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تو نے اسے مارا؟ میری بچی پر ہاتھ اٹھایا؟ میری شہزادی کو رلایا ـــ؟"

اور قبل اس کے کہ شاہد سمجھ سکے کہ کیا ہونے والا ہے، حمیدہ نے تڑا تڑ کئی طمانچے اس کے گال پر لگا دیے۔ پھر ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی کمرہ میں لائی اور تخت کے سامنے ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا "اب کبھی اگر اس طرح کی حرکت کی تو ہاتھ کاٹ دوں گی، سمجھے؟" پھر اس نے نوشابہ کو کلیجہ سے لگا لیا اور پیار کرتے ہوئے کہا۔



"نہیں منی! زیادہ نہیں روتے، چپ ہو جاؤ، شاباش!"

نوشابہ کی تسکین شاہد کی پٹائی سے ہو چکی تھی۔ وہ چپ ہو گئی۔ ذرا دیر کے بعد مسکرانے لگی، باتیں کرنے لگی۔ حمیدہ نے الماری کھولی۔ اس میں سے کچھ مٹھائی نکالی اور نوشابہ کے سامنے رکھ دی۔

"تو بھی کھاؤ تھوڑی سی ـــ!"

نوشابہ کی دوسری کمزوری کہانی کے علاوہ مٹھائی تھی۔ اس نے یہ پیش کش بڑی آمادگی اور مستعدی سے قبول کر لی۔ شاہد صاحب اب تک منہ پھلائے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ نوشابہ نے مٹھائی کی طشتری سے ایک بالوشاہی نکالی اور لے جا کر شاہد کے ہاتھ پر رکھ دی۔ یہ گویا درخواستِ صلح تھی۔ اصل میں شاہد سے تو بہت سے کام نکلتے تھے۔ کہانیاں کہنے میں باپ کی طرح وہ خود بھی مشاق تھا۔ لطیفے ایسے ایسے سناتا کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ باتصویر رسالے بھی خرید خرید کر اس کے لئے لاتا اور دکھاتا۔ مستقل جنگ کی صورت میں ان سب سہولتوں اور رعایتوں سے محروم ہونا پڑتا۔ لہٰذا بہتر یہی تھا کہ صلح کر لی جائے اور صلح بھی دست کے نہیں کی جا رہی تھی۔ حریف کی اچھی طرح پٹائی ہو چکی تھی۔ اس صلح کا آغاز اگر اسی سے ہو تو اور بھی اچھا ہے۔ بہرحال یہ سب کچھ سوچ کر نوشابہ نے ایک بڑی بالوشاہی شاہد کے ہاتھ پر رکھ دی۔ یہ حضرت بھرے بیٹھے تھے۔ نوشابہ نے جو دستِ مبارک پر بالوشاہی رکھی، انھوں نے ایسا محسوس کیا جیسے کسی نے دہکتا ہوا انگارہ رکھ دیا۔ دیوار پر کھینچ کر اس طرح مارا کہ سینکڑوں ٹکڑے ہو گئے۔ بے چاری بالوشاہی کے کوئی ادھر گرا کوئی ادھر گرا۔

نوشابہ سہم گئی۔ حمیدہ نے نظر اٹھا کر دیکھا اور سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ
پھر لپک کر مارنے کے لئے اٹھی۔

"میں کہتی ہوں آج تجھے ہو کیا گیا ہے؟ وہ مٹھائی دے رہی ہے
اور تو اس طرح اٹھا کر پھینک رہا ہے جیسے کوئی غلیظ چیز ہاتھ پر رکھ دی
پھر شامت آئی ہے تیری شاہد؟"

اب تو شاہد کا منہ اتر گیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے گولے گرنے
لگے اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں زور سے کہا۔

"ہم نہیں کھاتے مٹھائی!"

حمیدہ نے پوچھا "کیوں نہیں کھاتے؟ کیا زہر ملا تھا؟"

وہ ذرا زیادہ زور سے رونے لگا اور پہلے سے زیادہ زوردار
لہجہ میں گویا ہوا۔

"ہمیں اچھی نہیں لگتی!"

شاہد کے رونے کی آواز کہیں حسینہ بیگم کے کان میں پڑ گئی۔
وہ بھی سیدھی یہاں پہنچی، دیکھا نوشابہ کے سامنے مٹھائی کی طشتری
رکھی ہے، وہ چپ چاپ کھڑی ہے۔ شاہد صاحب رو رہے ہیں
اور چیخ رہے ہیں۔ حمیدہ کے تیور بتا رہے تھے کہ پھر پیٹے گی۔ حسینہ نے
شاہد کو کھینچ کر اپنی ٹانگوں سے لگا لیا اور پیار بھرے لہجہ میں پوچھا
"کیا ہوا بیٹے؟"

بیٹے صاحب سسکیوں اور ہچکیوں سے رونے لگے۔ حمیدہ سے
پوچھا:۔

"بتا دو بہن کیا ہوا لڑکے سے جو اتنا بپھر ڈالا کسی طرح آنسو



رکتے ہی نہیں اس کے؟"

حمیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا!

"تماشہ ہے، بڑا ہو کر بہت بڑا اداکار بنے گا ــــــ ذرا دیکھو تو
کیسا منہ بگاڑ کر رو رہا ہے جیسے کسی نے ذبح کر دیا ہے"

حسینہ نے کہا "خدا نہ کرے وہ کیوں ذبح ہونے لگا......
لیکن بتا دو نا کہ نہیں کیا بات ہوئی؟"

آخر حمیدہ نے ساری داستان از اول تا آخر سنا دی، پھر کہا۔

"اس مرتبہ تو میں نے صرف چانٹے لگائے تھے، آئندہ اگر ایسی حرکت
کی تو انگلیاں کاٹ دوں گی چاقو سے!"

حسینہ بیگم نے نوشابہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"بڑی فتنی بن گئی ہے۔ خوب لگائی بجھائی کرنا آگیا ہے۔ اب اگر شاہد
کی کسی چیز کو ہاتھ لگایا، تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ بتائے دیتی ہوں!"

پھر حمیدہ سے کہا!

"تم بھی سن لو بی! شاہد پر تمہارا کوئی حق نہیں، تم اس کی ہم سے
صرف شکایت ہی کر سکتی ہو، پھر ہم جانیں اور ہمارا بیٹا، تمہیں مارنے اور
سزا دینے کا کوئی حق نہیں ہے"

یہ کہا اور شاہد کو لئے ہوئے باہر چلی گئیں۔

# شاہد

دن گزرتے دیر لگتی ہے نہ زمانہ بدلتے!

یہ ایک سال اس طرح گزر گیا جیسے دو دن!

دلاور منزل کی دلچسپیاں کچھ ایسی تھیں کہ دن کب آیا اور کب گیا، اس کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ شاہد کی تعلیم اور تربیت کا خیال نوشابہ کی دلجوئیاں اور خاطر داریاں، ڈاکٹر صاحب کی محبت و شفقت، انجم بیگم کی عنایت اور خلوص، سب چیزیں کچھ اس طرح الجھائے رکھتی تھیں کہ دن کی آمد و رفت کا احساس ہی نہیں ہونے پاتا تھا۔ ہاں رات ضرور شب ہجراں بن کر نمودار ہوتی، کاٹے نہیں کٹتی تھی کسی طرح، جب سارا گھر خواب راحت کے مزے لوٹ رہا ہوتا، تب وہ قاسم کی یاد میں کروٹیں بدلا کرتی۔ اس کے خط کا مجموعہ ہر وقت تکیے تلے رکھا رہتا۔ نیند نہ آنے میں ذرا تاخیر کی اور اس نے نامۂ فراق کی تلاوت شروع کی۔ اب کہاں کی نیند اور

کہاں کا سونا!"

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

ساری رات عالم خیال میں قاسم سے باتیں کرتے، شکوہ و شکایت کرتے گزر جاتی۔ صبح ہوتی اور پھر وہی ہنگامہ آرائیاں شروع ہو جاتیں وہی نوشابہ، وہی شاہد، وہی حسینہ بیگم، وہی ڈاکٹر صاحب۔

لیکن اب یہ دور فراق ختم ہو رہا تھا۔ لندن سے قاسم کا خط آ گیا تھا۔ اس خط میں اس نے کامیابی کے ساتھ اپنے آنے کی بشارت دی تھی اور آخر میں لکھا تھا "اگر میری بچی، میری بی بی، میری راج دلاری نوشابہ ہوائی اڈے پر استقبال کو موجود نہ ہوئی تو میں طیارے سے واپس چلا جاؤں گا۔" اس خط سے گھر کے ہر فرد نے لطف لیا۔ خاص طور پر نوشابہ کی خوشی نہ بیان سے باہر تھی۔ وہ اپنی اہمیت محسوس کرنے لگی تھی کچھ ناز ہو چلا تھا اسے اپنے اوپر۔ شاہد سے اسی روز جس روز کی صبح قاسم کا جہاز آنے والا تھا بڑی معصومیت اور سنجیدگی کے ساتھ اس نے دریافت کیا۔

"کچھ معلوم ہے کل کون آ رہا ہے؟"

شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا!

"جی ہاں خوب اچھی طرح معلوم ہے!"

نوشابہ نے چھیڑتے ہوئے پوچھا!

"کیا ہوائی اڈے پر تم بھی چلو گے؟"

شاہد نے خوشی کا حصہ لیتے ہوئے نشاط و انبساط کے عالم میں جواب دیا ---"

ہاں ضرور چلوں گا! ——— تم بھی تو چل رہی ہو نا؟"
تمہی ٹھیک گی اور شرارت کے ساتھ نوشابہ بولی
"ہاں گئے نہیں چلوں گی، مجھے تو بلایا ہے۔ لکھا ہے اگر میری بچی نوشابہ
نہ آئی تو اسی طیارے سے واپس چلا جاؤں گا۔"
شاہد مسکرایا۔
"ادھر ابو بھی لکھ رہے ہیں، اگر آپ تشریف نہ لے گئیں تو وہ گھر میں قدم نہ
رکھیں گے، اسی طیارے سے واپس چلے جائیں گے۔"
نوشابہ: یہی تو لکھا ہے انھوں نے۔
شاہد: لکھا ہوگا!
نوشابہ: کیا تمہیں بھی بلایا ہے؟
شاہد: نہیں ———
نوشابہ: پھر کیوں جا رہے ہو؟
شاہد: اب نہیں جاؤں گا جہاں میری پوچھ نہ ہو۔ وہاں جا کر کیا کروں
گا!"
اتنے میں حمیدہ آگئی۔ اس نے نوشابہ اور شاہد کو باتیں کرتے جو
دیکھا تو پوچھا!
"کیوں بچی، شاہد نے کوئی شرارت تو نہیں کی؟"
وہ بولی، "جی نہیں، شرارت تو نہیں کی، لیکن کہتے ہیں، بھائی اور
بڑا ابا جان کو لینے نہیں جاؤں گا۔"
حمیدہ نے شاہد سے پوچھا "کیا کہہ رہا ہے تو نوشابہ سے؟"
وہ کہنے لگا: "یہ کہہ رہی تھیں کہ اگر آپ نہ گئیں تو ابا جان گھر میں قدم نہ



رکھیں گے۔ اسی طیارے سے لندن واپس چلے جائیں گے۔ میں
نے کہا، ہوگا، تمہیں۔ پھر مجھے چڑانے کے لئے پوچھا: تم کو بھی بلایا ہے
کیا؟ میں نے کہا نہیں، کہنے لگیں، پھر بھی جاؤ گے۔ میں نے جواب دیا
نہیں جاؤں گا!
حمیدہ ہنسنے لگی یہ کتنا حرفوں کا بنا ہوا ہے۔ اُف وہ ——— آخر
تو جلتا کیوں ہے میری بچی سے؟
شاہد نے کہا! "مجھے کیا غرض پڑی ہے کسی سے جلنے کی، ہاں
جو مجھ سے جلتا ہے، میں بھی اس سے جلنے لگتا ہوں۔"
حمیدہ: تجھ... سے کون جلتا ہے؟
شاہد: کوئی بھی ہوگا ——— کسی کا نام لینے سے کیا فائدہ؟
حمیدہ: دیکھ شاہد! تو بہت چل نکلا ہے، اتنا کہے دیتی ہوں، اگر نوشابہ
کو چھیڑا، تنگ کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"
شاہد: پوچھئے نوشابہ سے ——— کیوں بھئی نوشابہ! میں نے
چھیڑا تھا تمہیں؟"
نوشابہ: نہیں اس وقت تو نہیں چھیڑا ہے۔
شاہد: اور ویسے چھیڑتا رہتا ہوں؟
نوشابہ۔ اور کیا نہیں؟ کل رات کو میری کاپی پر بلی کی تصویر کس
نے بنائی تھی؟
شاہد۔ وہ تو میں نے اپنا کمال دکھایا تھا ——— کتنی جلدی بنا دی
تھی تصویر؟"
نوشابہ! ہاں! جلدی سے تو بنا دی تھی ——— بڑی اچھی تھی۔

rekhta

شاہد: تم ابھی کہہ رہی تھیں بچھڑے کو سنائی تھی؟

نوشابہ: بچھڑے کو تو سنائی تھی۔ حمیدہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ اس کی آنکھیں بالکل تمہاری جیسی ہیں۔ بتایئے کیا میری آنکھیں بھی ایسی ہیں؟

حمیدہ: نہیں بھئی! یہ تو جلتا ہے میری شہزادی سے۔ دیکھتی نہیں خود بالکل بندر نظر آتا ہے چہرے سے۔"

نوشابہ ہنسنے لگی۔ شاہد صاحب مسکراتے ہوئے باہر چلے گئے۔

---

# قیامت گزر گئی!"

آج بڑے اہتمام سے دلاور منزل کی صفائی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بار بار مطب سے اٹھ کر آتے ہیں اور دیکھ جاتے ہیں کام ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں۔ حسینہ بیگم سر سے پاؤں تک پسینہ میں شرابور ہیں۔ کبھی اس کمرے میں، کبھی کسی ملازم کو ہدایت دے رہی ہیں۔ کبھی کسی ملازم کو ڈانٹ رہی ہیں کبھی باورچی خانہ میں گھسی بیٹھی ہیں اور حمیدہ سے قاسم کے مرغوب اور پسندیدہ کھانوں کی فہرست مانگ رہی تھیں۔ شاہد صاحب الگ گم تھے اور اشتیاق اور انتظار میں وقت کاٹے نہیں کٹتا کہ کیا کیا اور کیسے کیسے تحفے لائیں گے اپنے ساتھ ابا جان۔

نوشابہ الگ شہزادی بنی گھوم رہی تھی۔ اسے تحفوں اور کھلونوں کا اتنا اشتیاق نہیں تھا جتنا اس بات کا اب کیسی کیسی نرالی کہانیاں سننے میں آئیں گی۔ قاسم نے اپنے خط میں حمیدہ کو بھی لکھا تھا کہ نوشابہ

کو بتا دیا تھا، حامد اس کے لئے بہت سی نئی اور نرالی کہانیاں سن کے یاد کر لی ہیں، وہ سب ایک ہی دن میں سنا دوں گا۔"

حمیدہ اپنے کمرے میں ہوائی اڈے جانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ کہ نوشابہ پہنچ گئی۔ اسے دیکھ کر حمیدہ پھول کی طرح کھل گئی! "آؤ بچی! آؤ! کیا کام ہے؟ کچھ پوچھنا ہے؟"

نوشابہ نے پوچھا "اب طیارہ کتنی دور رہ گیا ہوگا۔ یہاں سے؟"

اس معصوم سے سوال پر حمیدہ نے اسے پیار کر لیا اور کہا!

"بس بچی! بہت نزدیک آ گیا ہوگا۔ ایک گھنٹے میں وہ یہاں ہوگا۔"

نوشابہ نے سوال کیا "پھر اب چلئے کہیں ایسا نہ ہو، وہ آئیں اور مجھے نہ دیکھ کر واپس لوٹ جائیں۔"

حمیدہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی "میری بچی! ابھی چلتی ہوں، بس ابھی چلتی ہوں۔"

اتنے میں حسینہ بیگم بھی پھرتی پھرتی تشریف لے آئیں، کہنے لگیں۔

"بڑے راز و نیاز ہو رہے ہیں ماں بیٹی میں!"

حمیدہ نے کہا: "کچھ سنا نوشابہ کیا کہہ رہی ہیں؟"

بے دلی کے ساتھ حسینہ بیگم گویا ہوئیں: "نہیں سنا وہ تو ہر وقت چڑیا کی طرح چیں چیں کیا کرتی ہے۔"

یہ کہہ کر واپس جانے کے لئے مڑیں۔ حمیدہ نے کہا: "کبھی میرے سر کی قسم سنتی جاؤ بڑے مزے کی بات ہے۔"

حسینہ بیگم جاتے جاتے کھڑی ہو گئیں، بہ اشتیاق نظروں سے حمیدہ طرف دیکھنے لگیں۔ حمیدہ نے نوشابہ کی ساری گفتگو دہرا دی سن کر،

مسکرائیں اور جاتے جاتے کہنے لگیں" واقعی اب چلنا چاہئے۔ کار نکلواتی ہوں۔ تم جلدی سے نوشابہ کو لے آؤ۔ دراصل یہی کہنے آئی تھی۔ شاید بچی بڑی دیر سے منتظر رہا ہے۔"

ذرا دیر میں یہ لوگ تیار ہو کر ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گئے ڈاکٹر صاحب خود ہی موٹر ڈرائیو کر رہے تھے۔ ان کے پاس شاہد بیٹھا تھا۔ پچھلی سیٹ پر حسینہ بیگم، ان کے پاس حمیدہ اس کے پاس نوشابہ۔

کوئی بیس منٹ میں یہ مختصر سا قافلہ ہوائی اڈے پر پہنچ گیا۔ انکلوژر تک کے پاس پہلے سے منگوائے گئے تھے اور بھی بہت سے لوگ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے خیر مقدم کو موجود تھے۔ اشتیاق و انتظار کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بار بار لوگوں کی نظریں آسمان کی طرف جاتی تھیں اور پلٹ آتی تھیں۔ یہ دس منٹ دس برس ہو گئے جو کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آتے تھے۔ دفعتاً کچھ بھنبھناہٹ کی سی آواز آئی۔ لوگوں کے کان کھڑے ہوئے اور آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک دیو ہیکل طیارہ ہوائی اڈے کے چکر کاٹ رہا تھا۔ رومال ہلنے لگے نظریں طیارے پر جم گئیں۔

نوشابہ نے حمیدہ کی انگلی پکڑ کے پوچھا:

"یہی طیارہ ہے؟"

"ہاں بیٹی! یہی ہے۔"

پھر اس نے بے کلی کے ساتھ پوچھا:

"مگر یہ اترتا کیوں نہیں؟"

حمیدہ نے کہا "

"بس اب اڑا ہی چاہتا ہے۔ دیکھو، دیکھو دیکھو ــــ"

دفعتہً ایک لرزہ خیز دھماکے کی آواز آئی۔ شعلوں میں لپٹا ہوا طیارہ، جیسا کہ آواز کے ساتھ، دل دوز چیخوں کو گود میں لیے زمین پر گر پڑا۔ مسکراتے، ہنستے، خوش و خرم چہروں پر موت کا سناٹا چھا گیا۔

ہوائی اڈے کا میدان ماتم کدہ بن گیا۔ حمیدہ بے ہوش ہوگئی۔ اس کے دانت بیٹھ گئے۔ حسینہ بیگم کو چکر آ گیا۔ سر پکڑ کر، کانپتی ہوئی زمین پر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر صاحب کا دل خود ہی ڈوب رہا تھا۔ اب بے ہوش ہوئے اب بے ہوش ہوئے۔ شاہدہ اور نوشابہ ایک دوسرے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اور اس طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے جیسے بے جان مجسمے! آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔

لیکن چہرے اس طرح سفید پڑ گئے تھے جیسے کسی نے پچکاری سے سارا خون نکال لیا ہو۔ ان کی چشم حیراں پوچھ رہی تھی۔

"یہ کیا ہوا؟"

لیکن کون تھا جو اس سوال کا جواب دیتا؟"



# غم

اس حادثہ نے سب کے دل و دماغ پر غم و الم کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ جو تھا وہ بے حال، مدہوش اور دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک ٹیکسی کا انتظام کیا اور جلدی سے حسینہ اور حمیدہ، نوشابہ اور شاہدہ کو پکڑ کر گھر روانہ کیا۔ خود وہیں رک گئے کہ لاش اپنے ساتھ لے کر جائیں۔ پولیس کی رسمی کارروائی میں کئی گھنٹے صرف ہو گئے۔ اکثر لاشیں تو بالکل شناخت نہ ہو سکیں۔ چند قریبی دوستوں سے مخصوص نشانات و علامات کے باعث پہچان لی گئیں۔ انہی میں قاسم کی لاش بھی تھی۔ شام ہوتے ہوتے وہ اپنے محبوب بہنوئی کی میت کو لے کر گھر پہنچے۔ یہاں پھر سے ماتم بپا ہونے لگا۔ حمیدہ بے ہوش پڑی تھی۔ خود حسینہ بیگم بار بار شربت انار کے گھونٹ حلق میں اتار کر بے ہوش ہونے سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ [illegible] مشکل سے حمیدہ کو ہوش آیا تھا۔ اور حسینہ بیگم کی حالت ذرا

سنبھلی تھی، لیکن قاسم کی لاش جیسے ہی آئی۔ سارے گھر میں کہرام بپا ہو گیا۔ حمیدہ پھر بے ہوش ہو گئی۔ حسینہ بیگم کو پھر چکر آنے لگے۔ شاہد اب تک خاموش تھا۔ اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ نوشابہ بھی اب تک ضبط سے کام لے رہی تھی۔ وہ بھی چیخ چیخ کر آنسو بہانے لگی۔ حادثہ کی خبر سنتے ہی دلاور منزل دوستوں، عزیزوں، رشتہ داروں اور واقف کاروں سے بھر گئی۔ ڈاکٹر صاحب کی ہر دلعزیزی اور محبوب شخصیت، اور پھر قاسم کی جواں مرگی، جسے اطلاع ملی بھاگا بھاگا آیا اور ماتم گساروں میں شریک ہو گیا۔

گھر والوں کی اور بعض عزیزوں کی رائے تھی کہ تجہیز و تکفین صبح کی جائے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اس رائے کے خلاف تھے۔ انہوں نے کہا۔ "جتنی جتنی تجہیز و تکفین میں تاخیر ہوگی، اتنی ہی اتنی حمیدہ کی حالت نازک ہوتی جائے گی۔ پھر مذہب کا حکم بھی ہے کہ میت دفن کرنے میں دیر نہ کرنی چاہیے۔" آخر یہی طے پایا کہ فوراً قاسم کو منزل آخر تک پہنچا دیا جائے۔ قبرستان میں اطلاع کی گئی اور قبر کھدنے لگی۔ ڈاکٹر صاحب بار بار اندر جاتے اور باہر آتے۔ اندر جاتے، حمیدہ کی نبض دیکھتے، انجکشن دیتے، شاہد کو پیار کرتے، نوشابہ کے سر پہ ہاتھ پھیرتے، اس کی دلجوئی کرتے۔ حسینہ بیگم کے دل ناتواں کو سمجھانے کی کوشش کرتے اور پھر باہر آ کر تدفین کے انتظامات کرتے، اس کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتے۔ ملازموں اور متعلقین کو ضروری ہدایات دیتے۔ گھر کی افراتفری اور حالات کی نزاکت کے باعث وہ اپنا غم بھولے ہوئے تھے۔"



# حمیدہ

یہ دنیا بھی عجیب جگہ ہے۔ یہاں نہ خوشی کو قرار ہے، نہ غم کو۔ لوگ خوش ہوتے ہیں کہ رو دیں، روتے ہیں کہ ہنس دیں۔ نہ خوشی دائمی ہے نہ گریہ بے اختیار کو دوام حاصل ہے۔ یہ مختلف کیفیتیں ہیں جن سے انسان دوچار ہوتا رہتا ہے، ان میں سے گزرتا ہے اور پھر انہیں بھول بھی جاتا ہے۔ اگر ایسی کا ہر رہے تو زندگی اجیرن ہو جائے۔ زندہ رہنا ناممکن ہو جائے۔ دنیا کی رونق کا نام و نشاں باقی نہ رہے۔

قاسم کی جواں مرگی پہ عزیز اور دوست تو الگ رہے، دشمن اور مخالف تک خون کے آنسو رونے لگے۔ وہ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ، وہ اس کی شوخی اور بذلہ سنجی۔ وہ اس کا خلوص اور اپنائیت، وہ اس کی ہمدردی اور ملنساری، وہ اس کا اخلاق اور تپاک، وہ سب کے ساتھ اس کا یکساں ربط و تعلق، ایک ایک بات یاد آتی تھی۔ جب ذکر چھڑ جاتا تو

گھنٹوں اور پہر دن بس اسی کی باتیں ہوتی رہتیں۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد یہ ساری باتیں، قصہ ماضی بن گئیں۔ لوگ پھر اپنے کاموں میں لگ گئے۔ اپنے اپنے دھندوں میں مصروف ہو گئے۔ وہی دلاور منزل تھی جہاں دلاور دولہ بن کر آیا تھا، جہاں سے اس کی لاش اٹھی تھی۔ جہاں ہر وقت اس کا ذکر ہوا کرتا تھا اور اب اسی دلاور منزل میں پھر قہقہے گونجنے لگے۔

... مجلس آرائیاں شروع ہو گئیں، مشاعرے ہونے لگے، پارٹیاں ترتیب پانے لگیں۔

وہی ڈاکٹر صاحب، جو قاسم کے غم میں ادھ مرے ہوئے جا رہے تھے اب پھر پابندی سے مطب میں جانے لگے۔ مریضوں کی پرسش احوال کرنے لگے۔ مسکرانے لگے، ہنسنے لگے۔ وہی حسینہ بیگم جن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے جاری تھے، اب پھر معمول پر آ گئیں۔ وہی ناشتہ کا اہتمام، وہی کھانے کی فکر، وہی ریڈیو، وہی سینما، وہی سیر، وہی تفریح، وہی ناول، وہی رسالے، وہی تبسم، وہی نغمہ طرازی

وہی عابد جو باپ کی لاش دیکھ کر بے تحاشہ رونے لگا تھا۔ اور جس نے کئی وقت کھانا نہیں کھایا تھا، اب پھر کھاتا ہے، پیتا ہے، ہنستا ہے، بولتا ہے، اسکول جاتا ہے، پڑھتا ہے، فیلڈ میں کھیلتا ہے۔ اسکول کی دلچسپیوں میں حصہ لیتا ہے۔ وہی کلثوم جو ہر وقت قاسم کو یاد کیا کرتی تھی، جو اس کے انتظار میں چشم براہ رہا کرتی تھی، اب پھر اپنی گڑیوں اور کھلونوں میں، ہمجولیوں اور سہیلیوں میں، پڑھنے لکھنے، سینے پرونے اور پکانے ریندھنے میں، ایسی مصروف ہے کہ شاید ہی کبھی سوچتی ہو کہ قاسم کون شخص تھا، جس نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔



جو اسے مزے مزے کی کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ جو اپنے اکلوتے بیٹے سے بھی زیادہ اسے چاہتا اور پیار کرتا تھا۔

ہاں ایک ہستی ایسی تھی، جو اس غم میں اپنی ساری پونجی ہار بیٹھی تھی ——

یہ حمیدہ تھی۔

جیسے جیسے دن گزرتے جاتے، حمیدہ کے دل میں قاسم کی یاد ایک تیر کی طرح پیوست ہوتی جا رہی تھی۔ اس غم نے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ جس دن سے قاسم مرا تھا، آج تک کسی نے نہ اسے ہنستے دیکھا ہے نہ مسکراتے۔ دن دن بھر کمرے سے باہر نہ نکلتی قاسم کو یاد کرنا اور یاد کرتے کرتے آہیں بھرنا اور رونا، یہی اس کا مشغلہ تھا۔

وظیفے سب چھٹے ایک نام تیرا
دعائے شام ہے وردِ سحر ہے

صبح ہو یا شام، اسے بس قاسم کی یاد سے کام تھا۔ نہ کسی سے مطلب نہ تعلق۔ ڈاکٹر صاحب نے لاکھ دل بہلانے کی کوشش کی، حسینہ بیگم نے بہتیرا سر مارا، لیکن حمیدہ کے دل کی کلی، کچھ ایسی مرجھائی کہ پھر نہ کھل سکی۔

نہ وہ کسی سے باتیں کرتی، نہ دوسروں کی باتوں سے دلچسپی لیتی۔ بس خاموش رہتی۔ اس چپ کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب دہل جاتے۔ وہ اکثر آنکھوں میں آنسو بھر کر حسینہ سے کہتے۔

خدا کے لئے حمیدہ کی خبر لو —— مجھے ڈر ہے کہیں اس

کی حرکت قلب بند ہو جائے۔ کہیں یہ پاگل نہ ہو جائے۔ یہ زندہ رہنے کے قابل نہیں ہیں۔

اور حسینہ بیگم بے بسی کے ساتھ جواب دیتیں:

"آپ ہی بتائیے کیا کروں، کونسا جتن ہے جو میں نے اسے خوش رکھنے کے لئے نہیں کیا؛ لیکن حالت یہ ہے کہ کبھی نمک نہیں کھاتی زیادہ اصرار کرتی ہوں تو لقمہ منہ میں رکھ کر ہولے ہولے رونے لگتی ہے۔ کچھ اس طرح روتی ہے کہ دل کانپ جاتا ہے۔ خود میری آنکھیں بھیگنے لگتی ہیں ـــــ ہائے یہ جوانی اور بیوگی!"

ڈاکٹر صاحب پوچھتے "پھر آخر کیا ہوگا بیگم؟"

وہ اور زیادہ آشفتہ خاطر ہو کر جواب دیتیں "میری تو خود عقل حیران ہے۔ غم ہی ایک ایسی چیز ہے جس میں ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ خوشی میں حصہ لینے والے بہت مل سکتے ہیں۔ لیکن غم کا بوجھ سہارا لینے والے بالکل نہیں ملتے، مل ہی نہیں سکتے۔"

ڈاکٹر صاحب لاجواب ہو کر پھر اپنے مطب میں واپس چلے جاتے



# تبدیلی

قاسم کی موت کو ایک سال سے زیادہ کی مدت گزر چکی تھی۔ اس مدت میں زمانے نے، گھر والوں نے، دوستوں اور عزیزوں نے قاسم کو بالکل فراموش کر دیا۔ لوگ مرنے والے کے ساتھ مر تو نہیں جاتے ہیں، جو زندہ رہنا چاہتے ہیں وہ زندوں ہی سے راہ و رسم رکھتے ہیں۔ زندگی کی ریت یہی ہے۔ ایسا نہ ہو تو یہ دنیا ماتم کدہ بن جائے۔ قاسم کی موت نے دلاور منزل کو واقعی ماتم کدہ بنا دیا تھا لیکن جہاں ماتم ہوتا ہے وہیں خوشی کے نقارے بھی بجتے ہیں۔ جہاں آہوں، ہچکیوں، سسکیوں اور فریاد و شیون کا شور ہوتا ہے، وہیں قہقہوں اور نغمہ طرازیوں کا غوغا بھی ہوتا ہے۔ شوہر کی وفات کے بعد اگر حالات نے حمیدہ کو اس گھر کا مستقل مکین نہ بنا دیا ہوتا تو شاید یہاں کے لوگ، اب سے بہت پہلے غم سے دامن جھٹک کر خوشی کے

ترانوں میں گم ہو گئے ہوتے! لیکن گھر کی خوشیوں میں ایک دھوئیں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا ——— یہ حمیدہ تھی!

شروع شروع میں تو حسینہ نے حمیدہ کے غم و الم کی کافی پذیرائی کی لیکن رفتہ رفتہ وہ اکتا سی گئی۔ محفل طرازیوں، محفل آرائیوں، نغمہ سرائیوں کا جب وہ کوئی اہتمام کرنا چاہتی، ڈاکٹر صاحب آہستہ سے کان میں کہتے:

"نہیں ابھی نہیں!" ——— حمیدہ کا مغموم اور مضمحل چہرہ دیکھنے کے بعد خوشی کی امنگ ختم ہو جاتی ہے۔ جب تک اس کا غم نہ بھلا جائے اس وقت تک کچھ نہیں ہو سکتا۔

شروع شروع میں تو حسینہ نے اخلاق اور لحاظ میں بات مان لی: لیکن جب حمیدہ کا غم کسی طرح کم نہیں ہوا، اس نے اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنا لیا، حسینہ کے اخلاق اور لحاظ کا ملمع اتر گیا۔ اب تو صاف محسوس ہوتا ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ حمیدہ یہاں رہ کر اس کے رنگ میں بھنگ کرتی رہے۔ باہر مردانے میں تو پھر بھی ڈاکٹر صاحب دوستوں اور ہم نشینوں سے دل بہلا لیتے تھے۔ لیکن اندر زنانہ میں تو ماتم کی فضا مستقل طور پر قائم تھی ——— لیکن وہ اپنے بھائی کی محبوب بہن تھی۔ اسے گھر سے نکالا بھی تو نہیں جا سکتا تھا۔

حسینہ کے عام برتاؤ میں بہت فرق آ گیا تھا۔ نہ وہ تپاک، نہ وہ گرم جوشی، نہ وہ اپنائیت، نہ وہ دل سوزی۔ کچھ اکھڑی اکھڑی سی کچھ کھنچی کھنچی سی نظر آتی۔ حمیدہ تھوڑی بہت سمجھ دار تھی۔ طرز عمل میں تبدیلی کو خوب محسوس کرتی اور بالکل خاموش رہتی۔ ... شکایت اپنے بھی

وہ اپنے غم خانہ سے نکل کر گھر کی دلچسپیوں میں بہت کم حصہ لیتی تھی اور اب یہ رنگ دیکھ کر تو باہر نکلنا تقریباً ترک کر دیا تھا۔ کوئی ایسی ہی مجبوری ہوتی تو حسینہ بیگم کے کمرے میں جاتی؛ ورنہ اپنے گوشۂ عافیت میں پڑی رہتی۔ تو شاہدہ البتہ وقت کا بڑا حصہ حمیدہ کے پاس صرف کرتی تھی! لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا، حسینہ بیگم کو یہ بات تھی۔ پسند نہیں۔ انھوں نے اب تک زبان سے تو کچھ نہیں کہا ہے لیکن طرز عمل بتا رہا ہے کہ حمیدہ کے ہاں اس کی زیادہ اور مستقل نشست و برخاست پسند نہیں کرتیں جب وہاں سے آتا دیکھتیں تو بے بات کی بات پر بھی ضرور جھڑکتیں، غلطی نہ ہوتی تو بھی تو کہتیں اور لتے لے ڈالتیں بے چاری ننھی سی جان کے۔ وہ حیرت سے ماں کو اس کے بگڑے ہوئے تیور کو، اس کی برہمی کو دیکھتی اور خاموش ہو جاتی۔ یہ انقلاب اس کی فہم سے باہر تھا۔ لاکھ لاکھ دماغ پر زور دیتی لیکن یہ فلسفہ کچھ ایسا اونچا تھا کہ کسی طرح سمجھ میں نہ آتا اصل معاملہ کیا ہے۔ اتنا تو سمجھ گئی تھی کہ ماں کی خفگی دراصل ہوتی کسی اور بات پر ہے لیکن کس بات پر؟ بس یہی ایسی گتھی تھی جو کسی طرح نہیں سلجھتی تھی۔

ایک روز گھر کے صحن میں وہ ماں کے پاس بیٹھی تھی، وہ بھی نہ جانے کیوں اس وقت خلافِ معمول خوش نظر آ رہی تھیں۔ اتنے میں شاہد آ گیا اسے دیکھتے ہی تو شاہدہ نے پوچھا:-

"کہئے ہمارا رسالہ لائے آپ؟ کہہ دیجئے بھول گیا۔"

شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھول تو گیا تھا، لیکن پھر واپس گیا اور لے آیا۔"

یہ کہہ کر ایک خوبصورت سا رسالہ اس نے تو شاہدہ کی طرف بڑھایا۔

وہ جوشِ اشتیاق میں لپکی، لیکن حسینہ نے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا
رسالہ شاہد کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسے الٹا پلٹا پھر نہایت حقارت
کے ساتھ شاہد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"معاف کرو بیٹا! میں نہیں پسند کرتی اس طرح کے رسالے لڑکیوں
کے لئے۔"

شاہد نے کہا: "لیکن ممانی جان! یہ رسالہ تو صرف لڑکیوں
کے لئے ہے۔ صرف انہی کے کام کی باتیں ہوتی ہیں اس میں۔"

نوشابہ نے شاہد کی تائید کی: "امی یہ بڑا اچھا رسالہ ہے۔ ہماری
ہیڈ مسٹریس اس کی بڑی تعریف کر رہی تھیں۔ تب ہی تو منگوایا تھا
میں نے۔"

لیکن اس دلیل سے وہ ذرا بھی متاثر نہ ہوئیں۔ اپنے فیصلہ پر
قائم رہیں۔

"بس زیادہ بک بک نہ کرو۔ میں نے جو کہہ دیا ہے وہی ہوگا۔
کوئی ضرورت نہیں ہے ایسے الم غلم رسالے پڑھنے کی۔"

یہ بات کچھ ایسے تیور اور انداز سے حسینہ بیگم نے کہی کہ شاہد بھی
لاجواب ہو گیا اور نوشابہ پر بھی سکوت چھا گیا۔ شاہد نے چپ چاپ
رسالہ لے لیا اور افسردگی کے ساتھ واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے
بعد، حسینہ بیگم نے ایسی آواز سے کہ الفاظ شاہد کے کانوں
میں بھی پڑیں، نوشابہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ بھی پسند نہیں ہے شاہد سے زیادہ بات چیت کرنے
کی ——— دیکھو نوشابہ! میرا غصہ بڑا برا ہے۔ جو کہوں اس
کے حرف بہ حرف کی تعمیل ہونی چاہئے۔"

بے چاری نوشابہ سہم کر خاموش ہو گئی ...

شاہد نے یہ الفاظ سن لئے اور اس کے پاؤں من من بھر کے
ہو گئے۔ نہ آگے بڑھتے بنتا تھا نہ پیچھے ہٹتے۔"

# سال گرہ

ایک سال اور گزر گیا۔ آج نوشابہ کی سال گرہ تھی ——!

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس اجڑے چمن میں پھر سے بہار آگئی ہے۔ قاسم کی حسرت آمیز موت نے دو سال پہلے ہمارے گھر پر جو افسردگی طاری کر دی تھی، وہ رفتہ رفتہ کم ہو چکی تھی اور آج تو بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ قہقہے، چہچہے، دل لگی، نغمہ سرائی، چہل پہل —— دور و نزدیک کے عزیز دار تھے اور سب ہی بڑھ چڑھ کر اس تقریب سعید میں حصہ لے رہے تھے۔ تحفوں کا انبار لگ گیا تھا گھر میں، جو آتا اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لاتا۔ نوشابہ کو سالگرہ کی اہمیت کا اتنا احساس نہیں تھا۔ جتنا ان قیمتی اور خوبصورت تحفوں کا۔ خوشی کے مارے اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ زرق برق لباس میں وہ بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ مہمانوں میں رشیدہ بھی تھی۔ یہ حسینہ کی چھوٹی بہن تھی۔ تنویر بھی تھی۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی خالہ زاد



بہن تھی۔ رشیدہ کے شوہر ایک سرکاری دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ تنویر کے شوہر ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ تنویر حمیدہ کی ہم سن بھی تھی اور ہمجولی بھی۔ بچپن سے دونوں میں دوستی تھی جو عمر کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتی رہی، شادی اور پھر اولاد کے تنازعن بھی اس رشتہ کو کمزور نہ کر سکے۔

نوشابہ کی محبت، حمیدہ کو بھی اس کے غم کدہ سے باہر کھینچ لائی۔ آج پہلی بار اس کے ہونٹ تبسم سے آشنا ہوئے تھے۔ دو سال کی طویل مدت کے بعد آج پہلی مرتبہ وہ گھر کی رونق اور چہل پہل میں حصہ لے رہی تھی۔ شاید آج کے دن وہ بھی اپنے غمکدہ میں گزار دیتی لیکن نوشابہ صبح صبح اس کے پاس پہنچی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی: "کیا آج بھی آپ اس کمرہ سے باہر نہیں نکلیں گی؟ دیکھیے [illegible] لوگ کہاں کہاں سے یہاں آئے ہیں۔ سب لوگ بڑھ بڑھ کے مجھ پر [illegible] آپ کو غمگین دیکھ کر خوش ہونے کو جی نہیں چاہتا ہے۔ اگر آپ نے آج حصہ نہ لیا تو میں یہیں بیٹھی رہوں گی آپ کے ساتھ!"

حمیدہ نے اُسے گلے سے لگا لیا، پیار کیا اور کہا۔

"بھی دل پر چاہے آرے چلیں، لیکن تیری خوشی ہر چیز پر مقدم ہے۔ اس گھر میں آنے کے بعد میں اپنی سب سے قیمتی پونجی لٹا بیٹھی! لیکن تجھے پا کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں نے کچھ کھویا ہے تو کچھ پایا بھی ہے۔ تجھے دیکھ لیتی ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے سارے غم فراموش ہو جاتے ہیں۔"

یہ سن کر نوشابہ خوش ہو گئی اس نے محبت بھری نظروں سے حمیدہ کو دیکھا اور کہا۔"

شاہد: ارے تم تو خفا ہوگئیں۔ ابھی ہم تحفہ دینے سے کب انکار کر رہے ہیں۔ لیکن یہ سوچ لو، اگر واپس کر دیا گیا جیسے وہ رسالہ واپس کر دیا گیا تھا، تو پھر ہماری خیر نہیں۔

نوشابہ: اوہو! وہ بات اب تک یاد ہے آپ کو؟

شاہد: ہاں: ——— جیسے آج ہی کا واقعہ ہے۔

نوشابہ: میں تو اسے بھول بھی گئی تھی ——— گڑے مردے کیوں اکھاڑ رہے ہیں آپ، ہاں جان کیسی بات ہے یہ گڑیا بھی عقل کی چیز ہاتھ لگ گئی ابرو چڑھیں۔ ویسے خود ہی رسالے منگا منگا کر دیتی رہتی ہیں۔"

شاہد: یہ تو میں بھی جانتا ہوں: وہ کتابوں اور رسالوں کی مخالف نہیں ہیں۔"

نوشابہ: تو کیا آپ کی مخالف ہیں؟"

شاہد: ہاں ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں، کچھ عرصہ سے۔"

نوشابہ: نہیں، یہ غلط فہمی ہے آپ کو ——— بہرحال کچھ بھی ہو، کوئی برا مانے یا خوش ہو، کسی کو غصہ آئے یا مسرت ہو، آپ کو تحفہ دینا پڑے گا ——— کیوں؟"

شاہد: کیسے انکار کر سکتا ہوں؟ ضرور۔

نوشابہ: تو بس جائیے، جلدی سے لے کر آئیے اور اماں کے سامنے دیجئے۔"

یہ کہہ کر وہ ہنسی اور مسکراتی ہوئی مہمانوں کے ہجوم میں گم ہوگئی

---

میرا دل کہہ رہا تھا، میری بات ضرور مان لیں گی آپ! ——— تو پھر چلیے نا!"

حمیدہ نے جواب دیا: بھئی تو چلو میں ابھی آتی ہوں، ذرا کپڑے بدل لوں، آدمی بن لوں، یوں ہی چلی چلوں، یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لگ گیا کہیں گے ——— بس تو بھی اور میں آئی!"

حمیدہ کے جواب سے خوش اور مطمئن ہوکر نوشابہ واپس چلی۔ راستہ میں شاہد مل گیا۔ اسے دیکھ کر خود بخود اس کے پاؤں رک گئے۔ وہ کھڑی ہوگئی۔ شاہد بھی ٹھہر گیا۔ نوشابہ نے کہا۔ کچھ آپ کو خبر ہے ——— آج کس کی سالگرہ ہے؟

شاہد نے جواب دیا۔

ہاں نوشابہ! جانتا ہوں، آج تمہاری سالگرہ ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کرو ———!

نوشابہ مسکرانے لگی، گویا ہوئی

خالی خولی مبارکباد؟

شاہد: پھر اور کیا چاہتی ہو تم؟

نوشابہ: کوئی تحفہ نہیں دیں گے آپ؟

شاہد: تحفہ ——— جی تو چاہتا ہے مگر ———

نوشابہ: (ہنستے ہوئے) مگر جیب خالی ہے۔

شاہد: نہیں یہ بات تو نہیں، لیکن ———

نوشابہ: لیکن ویکن کچھ نہیں، آپ نے اگر تحفہ نہ دیا تو جو دو رسالے مجھے دے آئے ہیں وہ بھی واپس کر دوں گی۔

# تحفے

تھکی جیسی پہیلی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ رشیدہ بیگم بری طرح نوشابہ پر مائل تھی۔ بار بار گلے سے لگاتی۔ پیشانی چومتی اس کے سہاگ، اقبال، ذہانت اور ستارہ اقبال کی تعریف میں گل افشانیاں کرتیں دوسرے مہمانوں کا بھی یہی حال تھا۔ نوشابہ ان سب کے بیچ میں ایسی لگ رہی تھی جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند۔

شام کو چار بجے کے قریب پارٹی باقاعدہ طور پر شروع ہوئی۔ سب سے پہلے رشیدہ نے پانچ سو روپے کے نوٹوں کا ایک ہار نوشابہ کے گلے میں پہنایا۔ پھر ایک نہایت زرق برق ریشمی جوڑا عطا کیا۔ پھر بڑے جوش سے بلائیں لیں۔ اور سچ پوچھیے تو یہ کتنا ظاہر کی کاوش یہ بھی پوری ہو جاتی، پھر تنویر نے ایک قیمتی گڑیا جو کسی طرح تیس چالیس روپے سے کم کی نہ ہوگی اور چابی سے چلنے والی ایک نہایت



خوبصورت ریل گاڑی بی نوشابہ کی خدمت میں پیش کی۔ پھر دوسرے مہمانوں کی طرف سے تحفوں کی بارش شروع ہوئی۔ کسی نے چھوٹا سا چائے کا سیٹ دیا، کسی نے شیشہ کی الماری، کسی نے سونے کی انگوٹھی، کسی نے چاندی کی پازیب، کسی نے روپے، کسی نے اشرفی۔ حسینہ بیگم مسکرا مسکرا کر یہ تحفے قبول کرتیں اور نوشابہ کے سامنے ڈھیر کرتی جاتی تھیں۔ سب سے آخر میں حمیدہ اٹھی، اس نے تاج کمپنی کی چھپی ہوئی ایک ننھی سی حمائل جو ریشم کے دیدہ زیب جزدان میں لپٹی تھی، نوشابہ کے گلے میں ڈال دی۔ اس تحفے سے نوشابہ بہت خوش ہوئی۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ لیکن حسینہ بیگم کے چہرے پر بے لطفی اور بدمزگی کے ایسے آثار پیدا ہو گئے جو چھپائے نہ چھپ سکے۔ مہمان باہمی خوش گپیوں میں ایسے مصروف تھے کہ کسی نے اس طرف توجہ نہ کی۔

مغرب تک سب رخصت ہو گئے۔ اتنے میں شاہد باہر سے گھر میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی نوشابہ نے کہا:

"دیکھئے مجھے آج اتنے تحفے ملے ہیں!"

شاہد نے تحفوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"بڑے اچھے، بڑے قیمتی، بہت عمدہ! ——— طبیعت خوش ہو گئی انھیں دیکھ کر!"

اب تو نوشابہ نے ایک چٹکی لی:

"ذرا بتائیے تو ان میں آپ کا دیا ہوا کون سا تحفہ ہے؟"

شاہد نے مسکراتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور تحفہ نکالنے ہی والا تھا کہ ٹھیاخ کی آواز بلند ہوئی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو معلوم

ہوا کہ حسینہ بیگم نے نوشابہ کے منہ پر طمانچہ مارا ہے، پھر اس کے کانوں
میں ان کی یہ آواز گونجی :۔

"بدتمیز، بے غیرت، بے حیا، بے شرم ——"

پھر وہ شاہد سے مخاطب ہوئیں :

"میں اس طرح کی باتیں کرنا قطعاً پسند نہیں کرتی، جاؤ، چلے جاؤ، مت آیا کرو اس طرف۔ عجیب لوگوں سے سابقہ پڑا ہے —— لاکھ لاکھ دامن بچاؤ، لیکن یہ ہیں کہ کسی طرح پیچھا چھوڑتے ہی نہیں، اماں جان حاتم اس شان سے دے گئیں جیسے کائنات کا خزانہ دے رہی ہیں۔ اب صاحبزادے تشریف لائے ہیں اپنے ٹھاٹھ دکھانے، خدا نظر جانے، فقیریت نہ جانے!"

اپنے ان آبدار الفاظ کا ردِ عمل دیکھنے کے لئے ان کی آنکھوں نے شاہد کو دیکھنا چاہا، لیکن معلوم ہوا وہ پہلے ہی حملہ کی تاب نہ لا کر رخصت ہو چکا تھا۔ نوشابہ بت کی طرح خاموش تھی۔ اس کی آنکھوں کے پیالے آنسوؤں کے قطروں سے لبالب بھرے تھے، لیکن حسینہ بیگم پر کوئی اثر نہ ہوا۔

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب تشریف لائے وہ مطب کے دوران میں وقت مقررہ پر کھانے کے لئے تشریف لے آتے تھے۔ کھانے کے بعد کچھ دیر گپ شپ کرتے تھے اور پھر مطب چلے جاتے تھے جہاں مریضوں، ملاقاتیوں اور آنے جانے والوں کا سلسلہ تقریباً گیارہ بجے رات تک جاری رہتا۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر حسینہ بیگم کھانا نکالنے باورچی خانہ میں چلی گئیں۔ مجبوراً وہ جلدی سے اٹھ



چھوٹی سی میز سامنے لا کر رکھ دی۔ شہزادی لوٹا، صابن اور سلفچی لے کر ہاتھ دھلانے آ گئی۔ اتنے میں شرافی خوان سر پر رکھے کھانا لے کر آ گیا جو میز پر چن دیا گیا۔ حسینہ بیگم بھی قریب ہی بیٹھ گئیں۔ ان کا معمول تھا ساتھ بیٹھ تو جاتی تھیں لیکن کھانا بعد میں کھاتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نوشابہ کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ لازمی طور پر انہی کے ساتھ کھاتی تھی۔ پہلا لقمہ توڑنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے پوچھا :۔

کیا آپا رشیدہ چلی گئیں!

حسینہ نے جواب دیا۔

جی ہاں چلی گئی، ماشاءاللہ بال بچوں والی ہے، گھر کس پر چھوڑے؟ بہت اصرار کیا لیکن رکی نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا: کس کس نے تحفے دیئے ہماری بیٹی کو؟

حسینہ: سب ہی نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق دیا۔ رشیدہ نے تو کمال کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب: کیا کمال کیا؟

حسینہ: پانچ سو روپے کے نوٹوں کا ہار پہنایا، پھر اسی قیمت کی کئی چیزیں دیں۔

ڈاکٹر صاحب! اچھا ——؟

حسینہ: جی ہاں اور کیا، بات یہ ہے کہ رشیدہ چاہتی بہت ہے نوشابہ کو بالکل اپنی اولاد کی طرح!

ڈاکٹر صاحب: ہاں میں جانتا ہوں —— حمیدہ نہیں دکھائی دی، کیا آج بھی اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی ——؟

حسینہ: آئی تو تھیں ذرا دیر کے لئے۔

ڈاکٹر صاحب: ہاں ضرور آئی ہوگی۔ وہ تو جان دیتی ہے نوشابہ پر ــــ

حسینہ: کیوں نہیں، انھوں نے بھی تو ایک بڑا قیمتی تحفہ دیا ہے نوشابہ کو۔

ڈاکٹر صاحب: اسے ان رسمیات میں حصہ لینے کی کیا ضرورت تھی؟ خوددار اتنی ہے کہ مجھ سے ایک پیسے کی روادار نہیں۔ حالت یہ ہے کہ قاسم نے پراویڈنٹ فنڈ کی صورت میں جو تھوڑا سا روپیہ چھوڑا تھا۔ اسی پر گزارہ ہے۔ نہیں لینا چاہیے تھا اس کا تحفہ!

حسینہ: "اے واہ! اتنا مقدس تحفہ واپس کرکے اپنی عاقبت خراب کرلی؟"

ڈاکٹر صاحب: "مقدس تحفہ؟"

حسینہ: "ہاں! ــــ (ہنستے ہوئے) حمائل شریف لٹکا گئی ہیں، نقشبندی کے گلے میں!

ڈاکٹر صاحب: (برہم لب و لہجہ میں) "مذاق اڑا رہی ہو اس کا، اس کی غربت پر طعن کر رہی ہو! تم آدمی کا دل نہیں دیکھتیں اس کی جیب دیکھتی ہو، خلوص اور محبت کی قدر نہیں کرتیں ــــ تصنع اور ظاہرداری پر جان دیتی ہو ــــ"

لاحول ولاقوۃ!

حسینہ: اے واہ! میں تو ایک سیدھی سی بات کہہ کر مصیبت



میں پڑ گئی۔ کیا باہر لڑ کر آئے ہو کسی سے؟

ڈاکٹر صاحب: نہیں! کسی سے لڑ کر نہیں آیا، لیکن تمہارے الفاظ نے مجھے دکھ پہنچایا ہے، تم نے حمیدہ کو ذلیل سمجھا۔ اس کی توہین کی۔

حسینہ: خواہ مخواہ ــــ مجھے کیا پڑی ہے کسی کو ذلیل کرنے کی، کسی کی توہین کرنے کی!"

ڈاکٹر صاحب: خیر زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں، معمولی تحفے قبول کرلو۔ قیمتی تحفے سب واپس کردو۔

حسینہ: واپس کردوں؟

ڈاکٹر صاحب: ہاں!

حسینہ: "کس جرم میں؟"

ڈاکٹر صاحب: میری مرضی یہی ہے، میری مصلحت کا تقاضہ بھی ہے۔

حسینہ: کیا رشیدہ کا تحفہ بھی واپس کردوں؟

ڈاکٹر صاحب: میں نے ایک عام بات کہی ہے۔ قیمتی تحفے جتنے ہیں اور جس کے بھی ہیں واپس کردو۔ صرف معمولی قسم کے رہنے دو ــــ

حسینہ: اس لئے کہ رشیدہ میری بہن ہے ــــ لیکن تنویر کا بھی تحفہ واپس کرنا پڑے گا۔ وہ آپ کی بہن ہے۔ سوچ لیجئے۔ کہیں بات بڑھ نہ جائے۔

ڈاکٹر صاحب: کوئی بات بغیر سوچے ہوئے میرے منہ سے نہیں نکلتی ــــ بہر حال یہ میرا فیصلہ ہے ــــ

کیوں بچی نوشابہ تیری کیا رائے ہے؟

نوشابہ: سب واپس کر دیجئے، میرا خود جی نہیں چاہتا۔

ڈاکٹر صاحب: شاباش، بڑی اچھی ہے ہماری بچی، اور کیوں نوشابہ کیا وہ حمائل بھی واپس کر دو گی، جو حمیدہ نے تمہیں دی ہے؟"

نوشابہ: نہیں ابا جان ایسا غضب نہ کیجئے گا!

ڈاکٹر صاحب: کیوں بچی؟

نوشابہ: ایک تو حمیدہ بچی کو بڑا صدمہ ہوگا۔ ویسے ہی ان کا دل ٹوٹا ہوا ہے ہر وقت کمرے میں بیٹھی چپکے چپکے رویا کرتی ہیں! دوسرے یہ تو اللہ میاں کا کلام ہے اس سے برکت ہوگی —

ڈاکٹر صاحب: (ہنستے ہوئے) کیا کہنا ہے ہماری بچی کا شاباش شاباش.........لیکن تم اپنی پھوپی کو سمجھاتی نہیں کہ نہ رویا کریں؟

نوشابہ: بہت سمجھاتی ہوں۔

ڈاکٹر صاحب: مگر وہ نہیں مانتیں؟"

نوشابہ: مجھے دیکھ کر جلدی سے آنسو پونچھ لیتی ہیں، مسکرانے لگتی ہیں۔ باتوں میں بہلاتی ہیں، لیکن ان کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر سب کچھ سمجھ جاتی ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب: اپنا زیادہ وقت وہیں صرف کیا کرو، سمجھیں؟

نوشابہ: جی...... میں تو زیادہ تر وہیں رہا کرتی تھی مگر.........



ڈاکٹر صاحب: مگر کیا؟ ـــ منع کر دیا ہے کسی نے؟

حسینہ: منع کون کرتا؟ ماشاء اللہ لڑکی سیانی ہو چلی ہے اور وہ شاہد میاں ایسے گھر گھسنے ہیں کہ کسی وقت نکلتے ہی نہیں۔ میں نے منع کر دیا ہے کہ زیادہ ادھر ادھر جانے کی ضرورت نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب: کیا شاہد کا پردہ کرانا چاہتی ہو نوشابہ سے؟

حسینہ: توبہ ہے، پردے کا کون کہتا ہے؟

ڈاکٹر صاحب: پھر اس احتیاط کا مقصد؟

حسینہ بیگم: احتیاط کا مقصد احتیاط کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب: نہیں بیگم ایسی باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں، ایسی باتیں نہ کرو جن سے تمہاری وقعت کم ہو گی، جو تمہاری شایان شان نہ ہوں۔"

حسینہ نے کوئی جواب نہیں دیا، پھر ڈاکٹر صاحب نے بھی کوئی بات نہیں کی، چپ چاپ بیٹھے کھانا کھاتے رہے۔ کھانے کے بعد سفیرا دی حقہ بھر لائی جو سلگ چکا تھا، اس کے کش لگاتے رہے اتنے میں حسینہ نے پان بنا کر سامنے رکھ دیا۔ پان منہ میں رکھتے ہوئے کہا:"

"یا تو اتنا اچھا پان نہ بنایا کرو، ورنہ دو سے کم نہ دیا کرو ایک سے کیا ہوگا؟"

حسینہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسرا پان بنا کر جلدی

سے پیش کر دیا۔ اسے بھی ڈاکٹر صاحب نے منہ میں رکھ لیا۔ کچھ کہنے والے تھے کہ ڈھونڈو آیا۔ اس نے بتایا، کئی مریض انتظار میں بیٹھے ہیں۔ وہ پان چباتے باہر چلے گئے۔

---

# آنسو!

قاسم کے انتقال کے بعد اگرچہ حمیدہ کا کوئی سہارا باقی نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن بڑی ہمت اور حوصلہ سے اپنا کام چلا رہی تھی ڈاکٹر صاحب اسے بہت مانتے اور چاہتے تھے۔ وہ خود بھی ہزار جان سے بھائی پہ صدقہ اور قربان ہوتی تھی لیکن ایک دن کے لئے بھی یہ گوارا نہ کیا کہ بھائی کی روٹی توڑتی اور بھاوج کے طعنے سنتی۔ روکھی سوکھی جو بھی میسر آتی، صبر و شکر کر کے کھا لیتی۔ پھٹے پرانے جیسے بھی کپڑے بہم پہنچتے پہن لیتی۔

نوشابہ کی تقریب سے فارغ ہو کر وہ گھر کے اس حصہ میں آگئی جو اس کا مسکن تھا۔ کوئی ملازمہ تھی نہ خادم، ڈاکٹر صاحب کے نوکروں سے کام لینا اس کے اصول کے خلاف تھا۔ جلدی جلدی کھانا پکایا اور شاہد کو آواز دی کہ آ کر کھا لے لیکن شاہد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر پکارا مگر جواب ندارد۔ شاہد کا جواب نہ پاکر اس کا بدن سنسنانے لگا دل دھڑکنے لگا۔ کہیں قسمت کا ڈنکو اس آخری پونجی کو بھی نہ لوٹ لے جائے۔ کھانا ویسے ہی چھوڑا۔ جلدی جلدی شاہد کے کمرہ میں پہنچی، وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ سر میز سے ٹکائے۔ سامنے کتاب کھلی رکھی تھی۔ ایک بازو پر سر دوسرے بازو سے منہ دکھانپ رکھا تھا۔ سسکیوں کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔ جیسے بہت زور سے رونا چاہتا ہو۔ لیکن ضبط سے کام لینے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ حمیدہ بے تاب ہو کر اس کے پاس پہنچی، اس کا سر اٹھایا، تو آنکھوں سے جھرنے اشک رواں دکھیں، روتے روتے چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر حمیدہ کے اوسان بجا نہ رہے۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا:۔

"شاہد . . . . کیوں رو رہے ہو بیٹے، کسی نے مارا؟ ڈانٹا؟ برا بھلا کہا؟"

مگر شاہد نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہاں سسکیوں کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ حمیدہ نے سر اٹھا کر گلے لگا لیا۔ اس کا سینہ اپنے دھڑکتے ہوئے دل جا سے لگا لیا اور پوچھا:۔

"میرے بچے بتاتا کیوں نہیں؟"

شاہد اب تک بہت ضبط سے کام لے رہا تھا، اب اس کی سسکیاں ہچکیوں سے بدل گئیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر شدت گریہ کے باعث زبان کام نہیں دیتی تھی۔ حمیدہ نے پھر اسے کلیجہ سے لگا لیا اور کہا۔

کیا تو مجھے بھی نہیں بتائے گا؟ کیا تو چاہتا ہے کہ میں بھی تیرے



ساتھ رو دوں؟ جس دن تیرے باپ نے کوچ کیا ہے۔ میں کبھی نہیں ہنسی کبھی نہیں مسکرائی رونا ہی میرا مشغلہ ہے، رونا ہی میری زندگی ہے ہاں ایک آس ضرور ہے تو مجھے خوش رکھ سکے گا، مگر دیکھتی ہوں تو بھی مجھے رلانے پر تل گیا ہے۔ اچھے اور ماں سے محبت کرنے والے بیٹوں کے یہی ڈھنگ ہوتے ہیں؟

شاہد نے جلدی جلدی آنسو پونچھے اور پھر محبت بھرے لہجے میں ماں سے کہا۔

"تم کیوں روؤ گی؟ تمہیں کسی نے تو کچھ نہیں کہا ——؟"

حمیدہ نے جواب دیا:۔

"مجھے رونا دیکھ کر کیا میں اپنے آنسو روک سکوں گی؟ ہاں مجھے تو کسی نے کچھ نہیں کہا ہے، لیکن بچے تو کسی نے کہا ہے"

اب شاہد کی حالت سدھر چکی تھی۔ اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا:۔

"کچھ بھی نہیں، میں نے تو بس یوں ہی ایک بات کہہ دی"

لیکن حمیدہ کی تشفی اس جواب سے نہ ہوئی، وہ بولی

"نہیں بیٹے یوں کام نہیں چلے گا، کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ تو مجھ سے چھپا رہا ہے"

شاہد کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک جھلک نمودار ہوئی وہ گویا ہوا:۔

"سچ کہتا ہوں اماں کوئی خاص بات نہیں ——"

"اچھا پہلے کھانا کھا لو۔ پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔"

حمیدہ نے بھی سوچا مفت میں کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے پہلے اس سے نپٹ لینا چاہیے۔ اتنے میں نوشابہ آتی دکھائی دی۔ وہ چپ چاپ آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ پپوٹے بھاری نظر آرہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا خوب رو کر آئی ہے۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر حمیدہ اور زیادہ پریشان ہو گئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں پوچھا:

"بھئی! اب تجھے کس حال میں دیکھ رہی ہوں، تو اتنی پریشان اور رودہانسی کیوں ہو رہی ہے؟"

نوشابہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک نظر شاہد پر ڈالی اور پھر ٹپ ٹپ آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی گرنے لگے۔ حمیدہ کی سمجھ میں خاک نہ آیا، لیکن شاہد سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ماں سے کہا:

"شاید اس لئے رو رہی ہے کہ میں نے کوئی تحفہ نہیں دیا۔"

"کیوں نوشابہ یہی بات ہے نا؟ اچھا مت رو، تو ہم تمہیں ایک اچھا سا تحفہ دیتے ہیں ---!"

یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈال رہا تھا اور ایک ننھی سی لیکن بے انتہا خوب صورت، مگر [illegible] تتلی نکال کر نوشابہ کے ہاتھ پر رکھ دی، یہ سفید اور نرم و نازک ریشوں کی بنی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر نوشابہ مسکرانے لگی، حمیدہ نے شاہد کی پیٹھ پر ایک ہلکا سا گھونسہ لگاتے ہوئے کہا۔

"شریر کہیں کا ---------- یہ تحفہ دے رہا ہے سالگرہ



کے دن میری نوشابہ کو؟ اپنا تحفہ اپنے پاس رکھو، ایسی چیزیں نہیں چاہئیں اسے۔"

نوشابہ کی وہ ہتھیلی جس پر تتلی رکھی تھی، مٹھی میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے کہا:

"اب یہ لے آئے ہیں تو لے لوں گی۔"

شاہد نے ہنستے ہوئے کہا:۔

"وہ تو لینا ہی پڑے گی، دیکھو تم سے کتنی ملتی جلتی ہے۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں ---"

نوشابہ بگڑی:۔

"دیکھئے آپ لیجئے پھوپھی جان، پھر انھوں نے چھیڑا! بس انہی باتوں پہ مجھے رونا آجاتا ہے ---!"

پھر اس نے شاہد سے کہا۔

"اگر کہیں میں رونے لگی تو پھوپھی جان وہ چار چوٹ کی مار ماریں گی کہ روتے نہیں بن پڑے گا آپ سے۔"

حمیدہ نے لقمہ دیا۔

"نہیں بھئی! یہ نہ کہو۔ تمہارے عزت ہے۔ نہ ہنستے دیر، نہ روتے دیر۔ ابھی آنسوؤں سے بہا رہا تھا۔ اس کی سسکیوں اور ہچکیاں دیکھ کر میرے تو پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی اور اب دیکھو ہنس رہا ہے۔ چہرہ مسکرا رہا ہے تمہیں ---"

"پھوپھی جان یہ رو رہے تھے؟"

حمیدہ: "ہاں بھئی! رو رہا تھا۔"

نوشابہ: کیوں؟

حمیدہ: میں نے بہت پوچھا مگر کیا مجال ہے جو منہ سے کچھ بولا ہو اور زیادہ زور زور سے رونے لگا۔ وہ تو کہو تم آگئیں جو چپ ہو گیا، کر رہا ہوگا مکر۔

شاہد: نہیں اماں مجھے مکر کرنا نہیں آتا۔

حمیدہ: تجھے کچھ بھی نہیں آتا ـــــ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کھائے گا یا اٹھا دوں؟"

شاہد: بہت زور سے بھوک لگی ہے چلئے ـــــ کیوں نوشابہ تم بھی کھالو دو لقمے۔

نوشابہ: کھالوں گی۔

شاہد: معلوم ہوتا ہے بھوک کی ہوا ورنہ اتنی آسانی سے رونا بند نہ ہو جاتی۔

نوشابہ: (مسکراتے ہوئے) ہاں یہی بات ہے۔

حمیدہ: لیکن کیوں بھئی تم نے اب تک کھایا کیوں نہیں؟

نوشابہ: جی نہیں چاہ رہا تھا بھیجی جان۔

حمیدہ: اچھا تو آؤ۔

حمیدہ پیچھے ہی آگے بڑھی، شاہد نے پیچھے سے کہا۔

لاؤ میری ٹی واپس کر دو۔

وہ مسکراتی ہوئی بولی:

واہ کیوں واپس کر دوں؟ کیا واپس لینے کے لئے دی تھی؟

شاہد نے جواب دیا۔



بات یہ ہے بھئی کہ یہاں ہمارے کمرے میں میز پر بھی رہے گی جب جی چاہے دیکھ لیا کرنا آگے۔

نوشابہ نے کہا۔

اتنی زحمت کیوں اٹھا دوں؟ اپنے ہی کمرہ میں کیوں نہ رکھوں کہ ہر وقت نظر کے سامنے رہے؟"

شاہد: مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن سوچ لو، ایسا نہ ہو بے چاری امی جان سے جائے اور تم الگ پٹو، ممانی جان کے غصے سے تو اب ڈر لگنے لگا ہے۔

نوشابہ: میں بھی بہت ڈرنے لگی ہوں ان سے ـــــ ابھی رو کیوں رہے تھے؟

شاہد: میں؟

نوشابہ: اندر کمرہ میں؟

شاہد: ٹھیک ہے ہم دونوں کو ہی رونا پڑا تھا، مگر وجہ تو جانتی ہو تم، وہی ممانی جان کی باتیں جن میں اپنایت ذرا نہیں ہوتی، منافرت بہت زیادہ جھلکتی ہے۔

اتنے میں حمیدہ کی آواز آئی۔

کیا کر رہے لگا رکھے، ـــــ پھر ٹھنڈا ہو جائے گا کھانا

دونوں جلدی جلدی کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے۔

# معصوم باتیں

حمیدہ ساجدہ، پھوپھی جی، شاہد اور نوشابہ کھانا کھا رہے تھے، کھاتے جاتے اور گھل مل کر ہنس ہنس کر باتیں کرتے جاتے۔ کھانا بہت سادہ سا تھا۔ ارہر کی دال، اور وہ بھی بغیر بگھری، تلے ہوئے آلو کے قتلے، روٹی اور چاول۔

"آلو بڑے مزے کے پکے ہیں۔ آپ کہیں تو جی چاہتا ہے سارے کھا جاؤں، نوشابہ کے حصے کے بھی ———"

نوشابہ بولی۔

"واقعی پھوپھی جان بڑے مزے کے ہیں۔ میں تو ان کے مقابلہ میں گوشت بھی نہ کھاؤں۔"

شاہد نے لقمہ دیا:

"اور کیا، اور یہ دال؟



نوشابہ: بڑے مزے کی ہے۔

شاہد: اس کا مزا اس لیے اور بڑھ گیا ہے کہ بگھری نہیں ہے ہم لوگ گھی ڈال کر کھانا بدمزہ نہیں کرتے۔

نوشابہ: اونہہ! آپ تو نہ جانے کیا کہنے لگے، میں تو سچ سچ کہہ رہی ہوں۔

حمیدہ: میں تو کہتی، یہ لڑکیوں ہی بے بات کی بات کیا کرتا ہے

نوشابہ: کھا تو رہی ہوں پھوپھی جان!۔۔۔ اب کہاں تک کھاؤں، بس کھا چکی۔

شاہد: جو کچھ کھایا ہے یہی دل پر جبر کر کے کھایا ہے۔ آخر اخلاق اور مروت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ بہرحال تمہارا شکریہ

نوشابہ: دیکھیے تو پھوپھی جان ان کی باتیں!

حمیدہ: تو ابھی تم بک بک بند کرے گا شاہد؟

شاہد: مجھے تو بہرحال یہی تو حق جان کرنا ہے۔ بک بک کر کے وقت کیوں ضائع کروں؟"

حمیدہ: دو ایک لقمے تو اور کھا لو بیٹی!"

نوشابہ: پھوپھی جان! کوئی انکار تھوڑے ہی ہے، خوب پیٹ بھر کے کھا لیا۔ زیادہ کھاؤں گی تو بیمار پڑ جاؤں گی۔"

حمیدہ: اچھا زیادہ نہیں، یہ آلو کے قتلے یوں ہی روٹی کے کھا لو

نوشابہ: "لائیے، آپ نہیں مانتی تو کھا لوں گی۔ دیکھئے تو یہ، پھوپھی جان آپ کے ہاتھ کا بنایا اتنے مزے کا کیوں ہوتا ہے؟

حمیدہ: اب تو مجھے بنائے گی، کیوں ری چھوکری؟"

نوشابہ: "بھیجی جان! اللہ قسم سچ۔"
شاہد: "تمہارے ہاں آج کیا پکا ہے؟"
نوشابہ: "میں نہیں جانتی۔"
شاہد: "آخر چھپانے کی کیا بات ہے۔ کیا ہم چرا لائیں گے وہاں سے؟"
نوشابہ: "سچ میں نہیں جانتی! امیاں نے کتنا کتنا اصرار کیا۔ مگر میں نے کھایا ہی نہیں۔ کھاتی تو جانتی کیا پکا ہے؟"
شاہد: "کیوں نہیں کھایا؟"
نوشابہ: "ہماری مرضی نہیں کھایا۔"
شاہد: "اماں نوشابہ کے لئے ابھی کوئی میٹھی چیز نہیں ہے؟"
حمیدہ: "میں کیا جانتی تھی، دسترخوان پہ بیٹھ جائے گی ورنہ ورنہ اب تک پانچ منٹ میں انڈے کا حلوہ تیار کر لیتی۔"
شاہد: "انڈے کا حلوہ! ---------- کیا بہت مزے دار ہوتا ہے نوشابہ؟"
نوشابہ: "ہاں ہوتا تو ہے!"
شاہد: "پھر کیوں نہیں کھاتیں؟"
نوشابہ: "ہے کہاں جو کھاؤں؟"
شاہد: "ابھی آ سکتا ہے۔"
نوشابہ: "منگائیے! کھا لوں گی، ضرور کھاؤں گی!"
شاہد: "اماں جان! سن لیا آپ نے؟ ——— کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ نوشابہ آلو کے قتلوں سے شغل کرتی رہیں اور میں



انہیں باتوں میں الجھائے رکھوں اور اتنی دیر میں آپ حلوہ تیار کر لیں۔ بات یہ ہے کہ آپ ہی نے سمجھایا ہے مہمان کی خاطر مدارات خوب جی بھر کے کرنی چاہیے۔"
نوشابہ: "تو میں مہمان ہوں؟"
شاہد: "ہاں اس وقت تو مہمان ہی ہو۔"
نوشابہ: "نہیں پھوپی جان! انہیں سمجھنے دیجئے ——— انڈے کا حلوہ مجھے پسند تو بہت ہے لیکن آج نہیں پھر کسی دن کھاؤں گی۔"
شاہد: "کس سے باتیں ہو رہی ہیں؟"
نوشابہ: "(ادھر ادھر دیکھتے ہوئے) ارے پھوپھی جان کہاں گئیں؟"
شاہد: "ان سے تم نے لال پری کی کہانی تو کئی بار سنی ہے، سنی ہے نا؟"
نوشابہ: "ہاں تو؟"
شاہد: "بس معلوم ہوا اماں جان سے بہت دوستی ہے۔ ابھی وہی اپنے اڑن کھٹولے پہ بٹھا کر لے گئی ہے۔"
نوشابہ: (ہنستے ہوئے) "اب اتنی بے وقوف تو نہیں ہوں کہ آپ کی باتوں پہ یقین کر لوں گی۔"
شاہد: "میں نے ایک سچی بات کہہ دی، یقین کرو یا نہ کرو۔"
نوشابہ: "کہیں پریاں سچ مچ تھوڑی ہوتی ہیں؟"
شاہد: "تو پھر یہ ساری کہانیاں جھوٹ کا پلندہ ہیں؟"

نوشابہ: اور کیا، بالکل جھوٹ۔

شاہد: تو امّی جان جھوٹی کہانیاں ہی ہوں گی۔

نوشابہ: سب ہی کہانیاں جھوٹی ہوتی ہیں

شاہد: میں تو امّاں جان کو بڑا سچا سمجھتا تھا۔ آنے دو، پوچھوں گا

نوشابہ: کیا پوچھے گا؟

شاہد: یہی کہ آپ جھوٹ کیوں اُڑایا کرتی ہیں اپنی کہانیوں میں؟"

نوشابہ: واہ! میں نے کب کہا تھا؟

شاہد: مجھے تو یہی یاد پڑتا ہے۔ لیکن اگر تم نے کچھ اور کہا تھا تو بتا دو کیا تھا وہ؟"

نوشابہ: تمہاری بھیجی جان تو بڑی بچی ہیں، میں تو کہانیوں کو جھوٹا کہہ رہی تھی ـــــ اور کہانیوں کا ذکر بھی آپ نے نکالا، لال پری کا قصہ چھیڑ کر۔

شاہد: لال پری ـــــ واقعی عجیب چیز ہیں۔ لال پری صاحبہ بھی۔

نوشابہ: کیا آپ نے انہیں دیکھا ہے؟"

شاہد: ایک بار؟ ـــــ بیسیوں مرتبہ آئی ہیں تو گھنٹوں اور پہروں بیٹھی ہیں، اس وقت تو تمہیں دیکھ کر چلی گئیں۔

نوشابہ: میں نے کیا بگاڑا ہے ان کا؟

شاہد: پریوں اور جنوں کا قاعدہ ہے کہ وہ ان جانے لوگوں

کے سامنے نہیں آتے اور اگر آتے ہیں تو بھیس بدل کر، تاکہ وہ انہیں دیکھ کر ڈر نہ جائیں۔"

نوشابہ: تو کیا لال پری اس وقت بھی بھیس بدل کر آئی تھی؟

شاہد: "ہاں اور کیا؟"

نوشابہ: لیکن یہاں تو اب تک کوئی نہیں آیا؟"

شاہد: اسی لیے تو تمہیں بے وقوف کہتا ہوں، اگرچہ باجی ہو۔ خواہ مخواہ۔"

نوشابہ: تو بتاؤ کون آیا تھا؟

شاہد: ابھی کمرے میں ہوا کا ایک جھونکا زوردار نہیں آیا تھا؟

نوشابہ: ہاں آیا تو تھا۔

شاہد: وہی لال پری تھی ـــــ ذرا سوچو تو بیٹھے بیٹھے اماں کہاں ایک دم غائب ہو جاتی ہیں؟"

نوشابہ: یہ تو واقعی سمجھ میں نہیں آتا ـــــ کب آئیں گی واپس؟"

شاہد: آتی ہی ہوں گی ـــــ تم یہاں بیٹھی ہو، ان کا جی تھوڑے لگے گا وہاں، بس ذرا دیر بیٹھ کر چلی آئیں گی۔

نوشابہ: آخر اس وقت جانے کی ضرورت ہی کیا تھی، کبھی اور وقت چلی جاتیں؟

شاہد: بات یہ ہے کہ لال پری کے بس ایک ہی لڑکی ہے۔

نوشابہ: تو اس سے کیا ہوتا ہے؟

شاہد: اور وہ بے چاری چیچک میں مبتلا ہو گئی ہے۔

نوشابہ: (ترس کھاتے ہوئے) چیچک میں مبتلا ہو گئی ہے؟

شاہد:۔ ہاں: ———— کل اس کی ایک آنکھ جاتی رہی ہے۔ اس مرض سے ۔

نوشابہ: ہائے تو کیا وہ کانی ہو گئی ہے بیچاری؟"

شاہد: ہاں بھئی ہاں ———— اور آج دوسری آنکھ میں بھی نکل آئی ہے ۔

نوشابہ: چچ چچ: ———— کہیں اندھی نہ ہو جائے غریب!

شاہد: اسی لیے تو اماں گئیں ہیں کہ اسے بچالیں ۔

نوشابہ: تو کیا وہ حکیم ہیں؟"

شاہد:۔ تمہیں تو کچھ بھی نہیں معلوم ———— بہت بڑی حکیم ہیں اماں جان!

نوشابہ: ہوں ———— کہیں ہوئی نہ ہوں ۔

شاہد: سچ ———— بھائی بچپن میں یہی تو سمجھتا تھا کہ ماموں (ڈاکٹر مولادر) ڈاکٹر بن گئے اور اماں حکیم چنانچہ وہ ڈاکٹر بن گئے، یہ حکیم بن گئیں ۔

نوشابہ: اماں میاں کو تو ہر وقت مریض گھیرے رہتے ہیں کھانے تک کی فرصت نہیں ملتی ۔ پھپھی جان کے پاس تو میں نے کبھی کوئی مریض نہیں دیکھا؟"

شاہد: واقعی بڑی بے وقوف ہو نوشابہ، رحم آتا ہے مجھے تم پر ۔



نوشابہ: یہ بھی اچھی رہی ———— بے وقوفی کی بات میں کر رہی ہوں یا آپ؟

شاہد: بھائی معاملہ یہ ہے کہ اماں صرف پریوں کا علاج کرتی ہیں ۔"

نوشابہ: آدمیوں کا کیوں نہیں ۔؟"

شاہد: وہ پرستان کی سرکاری طبیب ہیں ۔ اگر پریوں کے علاوہ کسی اور کا علاج کریں تو انہیں "فوراً" مار ڈالا جائے ۔ اپنے قاعدوں میں پریاں بڑی سخت ہوتی ہیں ۔ ذرا رعایت نہیں کرتیں ۔

نوشابہ: اچھی زبردستی ہے۔"

شاہد: نہیں، زبردستی نہیں ۔ یہ تو قاعدہ کی بات ہے ۔ ماموں جان اگر گورنمنٹ کے ڈاکٹر بنا دیے جائیں تو کیا کسی اور کا علاج کر سکتے ہیں ———— بتاؤ؟

نوشابہ: ہاں پھر تو نہیں کر سکتے۔"

شاہد:۔ بس تو اسی طرح اماں بھی مجبور ہیں ۔ ورنہ بھلا سوچو تو سہی تمہیں یوں اپنے ہاں نہیں چھوڑ کر کہیں جا سکتی تھیں؟"

نوشابہ: تو پھر پرستان والے انہیں باقاعدہ تنخواہ بھی دیتے ہوں گے ۔؟

شاہد: انہیں دیتے تو آخر ہم لوگ کھاتے پیتے کہاں سے

نوشابہ: کیا تنخواہ ملتی ہے پھپھی جان کو؟"

شاہد: یہ بھی ایک راز ہے۔

نوشابہ: راز؟

شاہد: ہاں ـــــ پرستان کی کوئی بات دنیا کے لوگوں کو نہیں بتائی جا سکتی، ورنہ جان کے گاہک ہو جاتے ہیں۔ وہ تو یہ باتیں میں نے تمہیں بتا دیں، خبردار! اگر ہماری بات چیت، جو باتیں ہوئیں ان کا چرچا نہ کرنا کسی سے ورنہ اپنی چھوٹی جان سے، تمہیں اتنا پیاری ہو، ہاتھ دھونے پڑیں گے تمہیں۔

نوشابہ: یعنی کہ وہ مار ڈالی جائیں گی؟

شاہد: ہاں ـــــ اور مفت میں میری جان بھی جائے گی۔ ویسے ہی وہ لال پری کی بچی جلتی ہے مجھ سے۔

نوشابہ: آپ سے جلتی ہے وہ، لیکن کیوں؟

شاہد: اب کیا بتاؤں، میں نے اس کی ایک چیز چرا لی تھی۔ وہی تو جو تمہارے پاس ہے۔ اسی لیے تو کہتا ہوں، چھپا کر رکھنا اسے ـــــ ارے ہاں آپ، تمہیں وہ انڈے کا حلوہ بھی لیتی آئیں وہاں سے ـــ؟



مرمت:-

حمیدہ نے جو حلوہ جلدی میں بنایا تھا، لیکن تھا مزے کا۔ نوشابہ تو جیسے اس پر ٹوٹ پڑی، کہنے لگی:-

بھابی جان نہ جانے آپ کے ہاتھوں میں اتنا مزا کہاں سے آگیا۔

شاہد صاحب نے فرمایا:-

تعریف تو ہم نے بھی سنی ہے، لیکن تجربہ کا موقع ملنے کی امید نظر نہیں آتی ـــــ کھاؤ کھاؤ!

نوشابہ ہنسنے لگی۔ اس نے پلیٹ شاہد کے سامنے کرتے ہوئے کہا ـــ

واقعی یاد نہیں رہا ـــــ لیجئے آپ بھی کھائیے!

حمیدہ: بیچ میں بول پڑی!

اس کی فکر نہ کرو۔ یہ تو جب جی چاہے گا، کھائے گا، تم کھاؤ!"

شاہد اس ذرا کو نہ سہہ سکا۔ بول اٹھا:

"ہاں اور کیا، دن بھر اندر کتابیں کھاتا ہے، جی اکتا گیا ہے اب تو اس سے، دیکھتا ہوں تو ایکا ایکی آنے لگتی ہے، توبہ، بچاؤ۔۔ سامنے سے"

نوشابہ کو پھر ہنسی آگئی

"اچھا باتیں نہ بنایئے ——— جھینپے تو ہنسی! بیچ انگلیاں چاٹتی رہ گئی!"

شاہد نے کہا۔

"وہ تو دیکھ ہی رہا ہوں!"

حمیدہ: "پھر بھی ہنسی آگئی؟"

"بچے کو پتا نہیں؟ ——— مجھے اور بنا دوں گی صبح، اس وقت تو میری بچی کو کھا لینے دے۔ ندیدا کہیں گا، کیا گھور رہا ہے بلیے کو، نوشابہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کھا لے میری بچی، کھالے"

شاہد نے جل کر کہا:

"کھالے میری بچی، کھالے ——— تو تمہی عمر کے حلوے کھا، رہا میرا بچہ وہ تو غم کھا رہا ہے گا۔ غم اور اگر حلوہ ساتھ ساتھ کھایا جائے تو نقصان کرتا ہے"

نوشابہ پھر ہنس پڑی

"دیکھئے بھیجی جان! نہ خود کھاتے ہیں، نہ کھانے دیتے ہیں۔"



شاہد کچھ جواب دینا چاہتا تھا کہ کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو حسینہ بیگم بے حد جلال میں کھڑی انہیں دیکھ رہی تھیں۔ نوشابہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ سہم گئی۔ جو لقمہ ہاتھ میں تھا وہ منہ میں نہ جا سکا۔ جیسے عین موقع پر کوئی چور پکڑ لیا گیا ہو

حسینہ بیگم نے قہر آلود نظروں سے گھورا اور طنزیہ لہجہ میں پوچھا۔

"بہت بھوک لگی ہے؟"

وہ کچھ جواب نہ دے سکی، آنکھیں نیچی کئے چپ چاپ بیٹھی رہی۔ لقمہ بدستور ہاتھ میں تھا۔ حسینہ نے کہا:

"ابھی سے تجھے یہ گن آگئے ہیں"

"چل اٹھ، بدبخت کہیں کی، گھر میں کھانے کو کہو تو بھوک نہیں ہے۔ دوسری جگہ جائے گی تو پیٹ میں چوہے دوڑنے لگیں گے۔"

حمیدہ چپ چاپ زہر میں بجھی ہوئی یہ باتیں سن رہی تھی۔ آخر ضبط نہ کر سکی، کہنے لگی:۔

"بھابی! تم تو خواہ مخواہ خفا ہو رہی ہو میری بچی پر، کیا کیا اس نے؟"

حسینہ: "ہمیں یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

حمیدہ۔ "کون سی باتیں؟"

حسینہ:۔ "تربیت کے معاملے میں کسی کی دخل اندازی بھی گوارا نہیں کر سکتی۔"

حمیدہ: "ٹھیک ہے لیکن نوشابہ نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی جس پر تربیت ضروری ہوتی۔"

حسینہ: "کیوں نہیں کی ہے ــــــــ وہاں بھوک کا پتہ نہ تھا،
یہاں مدیدوں کی طرح رال ٹپکی پڑتی ہے ۔ تعریف ہونا
اچھا ہے ؟ نہ بڑے پن کی عادت اچھی ہے ، گھر سا کھانا
چھوڑ کر دوسروں کے لئے توڑ نا قابلِ تعریف بات ہے ؟"
حمیدہ: ویسے تو بڑی بات ہے
حسینہ: اس تو ابھی برخوردو تیج مروی ہوں لڑکی کی یہ تو
تو ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے میں تو مارے مارے اتو کر دوں گی ..
دارادی کو ــــــــ حق دیکھو کیسی عزلتی ہوں آج تیری
لونشاہ اللہ کھڑی ہوئی ۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے
لگے ۔ حسینہ نے ایک تیر اور چلایا:
لاکھ نسوے بہاؤ بیاول نہیں تیجاں بالکل سے ۔
حمیدہ نے مجھے زیر اور ملائم لہجہ میں کہا: "
بھابی، ضرور کسی سے جھگڑ کر آئی ہو آج ، ورنہ اتنا غصہ ؟
حسینہ نے تیوری چڑھا کر جواب دیا:
ابھی میں لاکھ فیروں کی ایک تمری ہوں ، بد تمیز ، بد اخلاق
ہے وہ ، لیکن تب ، میں کسی کے بیٹے میں ٹانگ نہیں اڑاتی ، تو دونوں
سب معاملات میں کیوں الجھتے ہیں ؟ اتنا انصاف ہے یہ بھی؟"
حمیدہ: کوئی ایسا گناہ تو نہیں تھا کہ بچوں کے سامنے ذلیل
ذلیل کرنے لگو ، اگر تم سے چھوٹی ہوں ، سب کچھ کہہ سکتی ہو
لیکن ان بچوں کی تو بات ، جو ان کے سامنے ہو میرا بھرم
حمیدہ: مجرم ادھر ہے کچھ نہیں جانتی ، دوا ، بات ....

اتنی سے بدنام ہوں ، ابھی بچی رہوں ، لو لوگ تمہاری طرح سب بڑی
بھی تعریف کیا کریں ۔"
حمیدہ: میری کون تعریف کرتا ہے ۔ اور کون برائی کرتا ہے ، نہ میں
نے کبھی سوچا ، نہ سنا ، نہ اس پر تو تجربہ ہے !"
حسینہ: اپنی اپنی طبیعت ہے ــــــــ بہرحال صاف
صاف سن لو ، لونشاہ ۔ اب اگر اس طرف تم نے کبھی قدم
رکھا تو ٹانگ توڑ دوں گی اور حمیدہ تم بھی سن لو ، بچوں کو تیوڑا
بنا کر بلانے کی کوشش کرنا اچھی بات نہیں ہے ۔"
حمیدہ: کیا میں لونشاہ کو تیوڑا بنا کر اپنے سے ہلانے کی کوشش
کر رہی ہوں ؟"
حسینہ: اور کیا کر رہی ہو ؟ ــــــــ مجھے یہ باتیں
ایک آنکھ نہیں بھاتیں ۔
حمیدہ: تم مجھے اتنا غیر سمجھتی ہو بھابی ؟"
حسینہ: یہ غیر اور اپنے کا سوال نہیں ہے ، میں پسند نہیں
کرتی ایک بات بس وہ نہیں ہونی چاہیئے ۔
حمیدہ: آئندہ سے اس کا خیال رکھوں گی ۔
حسینہ: تو پھر میرے تمہارے درمیان کسی قسم کا جھگڑا نہیں ہوگا
حمیدہ: کہو تو لونشاہ کو ادھر آنے بھی نہ دیا کروں ؟"
حسینہ: اتنی دیر سے جھک کیا مار رہی ہوں آخر ؟
یہی تو میرا مطلب ہے !
حمیدہ: (رکتی ہوئی سانس سے) کیا کچھ سمجھ میں نہیں آتا ، اتنی جلد تم

بلکہ کیسے نہیں ؟

حسینہ : میں تو نہیں بدلی !

حمیدہ : اگر نہیں بدلیں تو پھر یاد کرو ، ایک نوشابہ میری لڑکی نہیں بن سکتی تھی ؟ اپنے ہاں سے کیوں عہد کر رہی ہو ؟ کیا شاید کو تم نے لڑکا نہیں بنایا تھا ؟ کیا اب بھی اپنے عہد پر قائم ہو ؟

حسینہ : اس طرح کی باتیں تو دن میں ہزار دفعہ ہوتی رہتی ہیں ، لیکن وہ سچ نہیں ہو جاتیں ، نوشابہ اس طرح تمہاری لڑکی نہیں بن سکتی ، شاید میرا لڑکا نہیں بن سکتا ۔

میں کہتی ہوں نوشابہ تو یہاں سے اٹھے گی نہیں !

نوشابہ چلی گئی ۔

حسینہ بیگم نے پھر تقریر جاری کر دی

مجھے تم سے ہمدردی ہے ، تمہارے غم پر میرا دل کڑھتا ہے ۔ لیکن کیا کر سکتی ہوں ؛ دنیا میں کوئی کسی کا غم نہیں بٹا سکتا ۔

حمیدہ : ٹھیک کہتی ہو بھابی ، میں یہ چاہتی بھی نہیں کہ کوئی میرا غم بٹائے اور پھر تم سے چاہوں گی ! تمہیں تو خوش رکھنے کے لئے تو اپنی جان بھی قربان کر سکتی ہوں ۔۔۔ بھلا یہ کس طرح چاہ سکتی ہوں کہ تم میری شریک غم ہو ؟

حسینہ : ہوگا ۔۔۔ یہ خالی خولی باتیں ہیں ۔

حمیدہ : لو میں چپ ہوئی جاتی ہوں ؟

حسینہ : ہاں یہی بہتر ہے ۔

حمیدہ : لیکن بھابی ۔۔۔



حسینہ : دیکھو حمیدہ بات یہ ہے کہ کل وہ آنے والی ہے رشیدہ

حمیدہ : اچھا رشیدہ ؟

حسینہ : ہاں ۔۔۔ وہ ہے ذرا تیکھے مزاج کی ، اسے یہ ذرا بھی پسند نہیں کہ نوشابہ ادھر آیا کرے ۔ آخر میری بہن ہے ، اسے ناراض تو نہیں کر سکتی تمہاری وجہ سے ؟

حمیدہ : ٹھیک ہے ، ناراض کرنا بھی نہیں چاہیے لیکن رشیدہ یہ کیوں نہیں چاہتیں کہ نوشابہ ادھر آئے ؟

حسینہ : میں کیا جانوں ، سچ پوچھو تو نوشابہ اب میری نہیں رشیدہ کی لڑکی ہے

حمیدہ : اچھا یہ بات ہے ؟ ۔۔۔ تو پھر وہ ٹھیک ہی تبلیغ کرتی ہیں ۔

حسینہ : یہ بھی کوئی بری بات ہو گئی ، جس پر طعن کا سلسلہ شروع ہو گیا ؟

حمیدہ : میں طعن تو نہیں کر رہی ہوں بھابی ، میں ایک بات کہہ رہی تھی ؟

حسینہ : لیکن زہر میں بجھی ہوئی !

حمیدہ : اب ایسی غلطی نہ ہوگی ۔

حسینہ : ایک اور بات بھی کہنا چاہتی ہوں ، جب تک رشیدہ یہاں رہے ، شاہد کو بھی اس طرف نہیں جانا چاہیے ۔ وہ اسے دیکھ کر بھڑک اٹھتی ہے ۔ وہ بالکل نہیں چاہتی کہ شاہد کا گھر کی لڑکیوں سے خلا ملا ہو ، آخر اب سیانا ہوتا جا رہا ہے

لڑکا۔ بات ٹھیک ہی تو ہے۔

حمیدہ: یہ بھی درست کہتی ہو ـــــ پھر ایسا کیوں نہ کروں، اپنے رہنے کا بندوبست کہیں اور کر لوں؟ ایک گھر میں رہ کر تو نشاط کے لیے بھی یہ نا ممکن ہوگا کہ ادھر کبھی نہ جھانکے۔ میرے لیے بھی یہ بڑا کٹھن امتحان ہوگا کہ اس سے بات نہ کروں۔ کہیں اور رہوں گی تو رفتہ رفتہ دل قابو میں آ ہی جائے گا۔

حسینہ:- یہ تم جانو، میں کیا کہہ سکتی ہوں بھلا!؟"

اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر حسینہ بیگم تشریف لے گئیں۔ شاہد چپ کھڑا تھا، جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ حمیدہ نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ بیٹے! ذرا کسی وقت اپنی تنویر خالہ کے ہاں چلے جانا، کہنا اماں نے بلایا ہے!"

وہ سر جھکائے چپ چاپ چلا گیا۔ حمیدہ اب تک ضبط کر رہی تھی، بیٹے کے چلے جانے کے بعد ضبط نہ کر سکی، آنسو کے دو بڑے بڑے قطرے آنکھ سے ٹپک پڑے۔

---



# گردش

معاملہ آنسو کے دو قطروں پر ہی ختم نہیں ہوا، شاہد کے جانے کے بعد، حمیدہ خوب جی بھر کے رو لی۔ آنسو تھے کہ امڈے چلے آ رہے تھے۔ وہ بار بار سوچتی تھی، حسینہ کیوں اس قدر بدل گئی ہے۔ یہ وہی تو ہے، جو ہر وقت اس کی خاطر مدارات میں ہی لگی رہتی تھی۔ اس کے اشارۂ چشم کو پہچانتی تھی، اس کی خوشی کی خوشی سے خوش ہوتی، اسے مسرور دیکھ کر خود بھی خندہ ہو جاتی تھی، یا اب وہی حسینہ ہے جو اسے چڑاتی ہے، اسے غمگین دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ اس کی خوشی چھین لی ہے اور غم کا بوجھ سر پر لاد دیتی ہے ـــــ ایسا کیوں ہے؟ یہ وہی حسینہ تو ہے، جو اس کی آمد کی منتظر رہا کرتی تھی اور یا اب یہ وہی ہے جو اپنے گھر سے نکالے دے رہی ہے!؟

وہ سوچنے لگی۔

میرا جرم اس کے سوا کیا ہے کہ پہلے امیر تھی اب غریب ہو گئی۔ پہلے ہزاروں خرچ کرتی تھی اب محتاج ہوں۔

لیکن اپنی قسمت اپنے ہاتھوں تو میں نے نہیں پھوڑی! خدا کی مرضی کے سامنے کون دم مار سکتا ہے۔ میری تو تقدیر لٹ گئی۔ میں کچھ نہ کر سکی۔ میرا سہاگ اجڑ گیا اور میں بے بسی کے ساتھ اسے اجڑتے دیکھتی رہی۔ میں تو اس قابل تھی کہ مجھ پر رحم کیا جاتا۔ لیکن میرا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ مجھے حقیر و ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ مجھے دکھ پہنچائے جاتے ہیں۔ میرے بچے کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔"

اور ہاں یہ رشیدہ بیگم صاحبہ، مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟

شاہدہ سے کیوں جلتی ہیں؟

نوشابہ کو کیوں نہیں میری طرف آنے دینا چاہتیں؟

شاید وہ چاہتی ہیں کہ اُسے خالد سے نامزد کر دیں؟

لیکن مجھے بھلا اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ جانتی ہوں، مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگتا تھا۔ شاہدہ کے باپ زندہ ہوتے تو کبھی میں نوشابہ کو نہیں لیتی۔ لیکن ایک غریب اور یتیم لڑکے کے لئے ایک امیرزادی کو بیاہ لانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔"

مانا کہ نوشابہ میری بھتیجی ہے، اس کا باپ میرا بھائی ہے، سگا بھائی ہے محبت کرنے والا بھائی ہے۔ لیکن وہ ایک لڑکی کا باپ بھی تو ہے۔

اندھے کنویں میں اپنی لڑکی کو دھکیل دینے کا ایک بہن کس طرح مطالبہ



لیکن خون کا تعلق بھی تو کم نہیں ہوتا۔ نوشابہ سے جو محبت مجھے ہے وہ مٹ تو نہیں سکتا! وہ میرے بھائی کی اکلوتی لڑکی ہے۔ اگر میں اپنے بھائی کو چاہتی ہوں تو بے شک مجھے نوشابہ سے بھی محبت ہے۔ آخر بھابی اس محبت کو چھیننے کی کوشش کیوں کر رہی ہیں؟ شوق سے اسے رشیدہ کے حوالے کر دیں۔ خالد بھی بڑی تیز ہوتی ہے۔ مجھے اس پر رشک ہو سکتا ہے۔ صدمہ صرف اس بات کا ہے کہ ایک گھر میں رہنے کے باوجود اس سے ملنے کی، میرے ہاں آنے کی، باتیں کرنے کی اجازت نہیں۔ میں اسے اپنے پاس بلا نہیں سکتی بٹھا نہیں سکتی۔

کیا صرف اس لئے کہ غریب ہوں؟"

شاید نوشابہ کی محبت اپنے دل سے کھرچ دینے میں مجھے کامیابی ہو جاتی لیکن کمبخت خود بھی تو مجھ سے محبت کرتی ہے۔ کتنا چاہتی ہے مجھے ذرا موقع ملا اور تیر کی طرح سیدھی آگئی میرے پاس۔ پیاری پیاری باتیں کر رہی ہے۔ ہنس رہی ہے ہنسا رہی ہے۔ کھانوں کی فرمائش کر رہی ہے، کھانا پکانے کے طریقے سیکھ رہی ہے۔ گھنٹوں اور پہروں بیٹھی ہے اور اٹھنے کا نام نہیں لیتی۔ خود اسے کتنا صدمہ ہوگا۔ اس ظالمانہ حکم کا! وہ یہاں سے روتی ہوئی گئی ہے۔ جی چاہا کہ گلے سے اور کلیجہ سے لگا لوں۔ خود بھی اس کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر رو دوں۔ مگر کیسے، وہ عورت میرے سامنے کھڑی تھی جو میری بھابی ہے۔ اس کے سامنے نہ میں رو سکی تھی نہ نوشابہ ——— ہم دونوں اپنا کلیجہ مسوس کر رہ گئے اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے؟

بھابی کی محبت، اپنائیت، خلوص، گرم جوشی، تپاک، اخلاق، یہ

سب چیزیں اس وقت تک تھیں جب تک میرا شوہر زندہ تھا۔ اس کے مرتے ہی سب چیزیں بھی مر گئیں۔ اب بھائی اور مجھ میں کوئی رشتہ نہیں رہ گیا، انسانیت کا بھی نہیں۔ اب وہ ایک بڑے آدمی بڑے ڈاکٹر اور بڑے انسان کی بیوی ہیں اور میں ایک غریب، مفلوک الحال اور آشفتہ روزگار عورت ہوں۔ ہم دونوں میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ اب زندگی بھر ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب نہیں آ سکتے۔ اب زندگی کی آخری سانس تک ہم میں تفرقہ قائم رہے گا۔

واقعی مجھے اس گھر سے چلا جانا چاہیئے ــــــ!

لیکن کیا بھائی جان جانے دیں گے؟

جانے دیں گے ــــــ بے شک وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں، میرا خیال کرتے ہیں، میرے غم اور پریشانی سے فکرمند ہو جاتے ہیں۔ آخر بھائی ہیں کہ۔ لیکن جس طرح وہ ایک عورت کے بھائی ہیں، اسی طرح ایک عورت کے شوہر بھی ہیں۔ بہن کہیں بھی رہے عزیزداری کا رشتہ بہرحال قائم رہے گا۔ لیکن بیوی؟ ــــــ وہ دھکیلی نہیں جا سکتی؛ اس کے ساتھ تو ہر حالت میں زندگی نباہنی ہے۔ میرا کتنا ہی خیال کرتے ہوں لیکن میرے لئے اپنا گھر تو نہیں اجاڑ سکتے اپنی بیوی کو خفا نہیں کر سکتے۔ اپنی اولاد کی ماں کو صدمہ نہیں پہنچا سکتے۔

ہاں میں غریب ہوں، مفلوک الحال ہوں، برباد ہوں، بدنصیب ہوں، لیکن جب دن سے وہ مرے ہیں آج تک میں نے کسی پر، حتیٰ کہ اپنے بھائی پر بھی بوجھ بننے کی کوشش نہیں کی۔ خدا کا شکر ہے



اب تک ایک پیسے کی بھی شرمندہ نہیں ہوں۔ اپنا کھاتی ہوں، اپنا پہنتی ہوں، چاہے وہ روکھی سوکھی کیوں نہ ہو، چاہے وہ پیوند لگا لباس کیوں نہ ہو۔

بھائی جان نے بار بار کوشش کی میں گھر ہی کھاؤں، شاہد کو تو زبردستی کئی دن تک اپنے ساتھ کھلاتے رہے، لیکن میں نے خوش اسلوبی سے بات ختم کر دی۔

بھابی جب میرے جانے کی خبر بھائی جان کو سنائیں گی تو وہ کیا کہیں گے؟

کچھ نہیں کہیں گے ــــــ وہ اپنے پیشہ میں اتنے مصروف و مشغول رہتے ہیں کہ سر اٹھانے کی مہلت نہیں ملتی۔ انہیں خبر بھی نہیں ہوتی کون آیا ہے کون گیا؟ انہیں پتہ بھی نہیں چلتا گھر میں کیا ہو رہا ہے؟

یہ صورتحال دیکھ کر ترس آتا ہے بے چارے پر۔ یہاں رہ کر ان کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کرنا میرے لئے مناسب نہیں ہوگا۔ میرا فرض ہے کہ انہیں سکون پہنچاؤں، انہیں ایک نئی پریشانی میں مبتلا کر دینا میری خودغرضی ہوگی۔"

یہی سوچ رہی تھی کہ شاہد آ گیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ ماں نے یہ حالت دیکھی مگر ضبط کر گئی۔ پوچھا:-

کیا ہوا؟ وہ کہنے لگا:-

خالہ نے کہا ہے کل ورنہ پرسوں ضرور آؤں گی ــــــ

# نیا رنگ

رشیدہ کے آتے ہی گھر کا سماں بدل گیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے آج سے سارے گھر کی انچارج وہی ہے۔ نوکروں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا، باورچی خانے کا انتظام، گھر کی صفائی، ناشتہ اور کھانے کا بندوبست، مہمانوں کی خاطر داشت، سارے کام انہیں کے دوش ناتواں پر آ پڑے اور وہ ہنسی خوشی اس نئی ذمہ داری کو سرانجام دے رہی تھی۔ حمیدہ بیگم بہن کے نظم و انتظام کو دیکھتی تھیں اور خوش ہوتی تھیں کہ چلو اچھا ہے ذرا آرام کا موقع مل گیا۔ ذرا سستا لوں، رشیدہ ہر کام کی دیکھ بھال کرے گی۔ اچھی طرح!"

دوسرے دن تنویر بھی آ گئی۔ کچھ دیر حمیدہ کے پاس بیٹھی، کچھ



پھر حمیدہ کے غم خانہ میں پہنچ گئی۔ حمیدہ نے دیکھتے ہی شکایت آمیز لہجہ میں کہا:-

"بھئی بے مروت ہو، اب آئی ہو تم؟"

تنویر پاس بیٹھتے ہوئے بولی:"

"تو کونسا ایسا ضروری کام تھا کہ ذرا دیر ہو گئی تو شکایت پڑ گئی؟ بتاؤ۔ کیا بات ہے...؟"

حمیدہ: ہونہہ! جاؤ نہیں بتاتے۔

تنویر: "اچھا تو پھر معافی ہو حضرت حمیدہ بیگم صاحبہ، دیکھئے گستاخی سرزد ہو گئی تو پھر شکایت نہ کیجئے گا۔ عرض کئے دیتی ہوں! ------"

حمیدہ مسکرانے لگی۔ تنویر نے پوچھا:"

"واقعی کوئی خاص بات ہے؟"

حمیدہ: ہاں بڑی خاص بات، ذرا سنجیدہ ہو جاؤ تو کہوں۔

تنویر: میری فکر نہ کرو، ہر وقت سنجیدہ ہو سکتی ہوں، لو ہو گئی۔ اب کہو

حمیدہ: کیا تمہارے محلے میں، تمہارے گھر سے قریب کوئی چھوٹا سا آرام دہ سا مکان مل سکتا ہے؟

تنویر: ایک نہیں تین ------ لیکن کیا کرو گی؟ کیا رہنا ہے وہاں؟

حمیدہ: ہاں تنویر! یہی فیصلہ کیا ہے میں نے۔

تنویر: (اضطراب کے ساتھ) کیا واقعی؟

حمیدہ: ہاں بھئی ہاں!

تنویر: لیکن کیوں؟

حمیدہ: حالات کا تقاضہ یہی ہے۔

تنویر: شاید تم بھی بھائی جان اور اکرم صاحب کے تقاضوں سے خائف ہو کچھ، لیکن ان سب چارے پر یوں ہی آتا ہے۔ صبح سے شام تک کتنی مصروفیت کی زندگی گزارنا پڑتی ہے انہیں۔

حمیدہ: ہاں جانتی ہوں ۔۔۔۔۔۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

تنویر: تو پھر حمیدہ بیگم سے اوصاف ہو گئی، بڑی لمبی کی پڑ رہا ہے۔ یہ عورت بھی، دیکھنے میں یوں جیسے انگارہ، باتیں سنئے تو سراپا اخلاق، ذرا قریب سے دیکھئے تو تنگ دل، تنگ ظرف، حاسد، زر پرست!

حمیدہ: تم نے تو بڑے بڑے خطاب دے ڈالے ہماری کو؟

تنویر: لیکن ان میں سے ایک بھی غلط فہمی یا مبالغہ کا شاہکار نہیں ہے۔ تم نے اس عورت کو دور سے دیکھا ہے، میں نے قریب سے دیکھا ہے۔

حمیدہ: بہت خوب ایک نقطہ نکالا ہے ہماری تنویر نے۔

تنویر: غلط نہیں کہتی، شادی کے بعد تم اور [illegible] ساتھ ایک شہر [illegible] دوسرے شہر کے [illegible] گئی رہیں۔ کبھی مہمانوں کی طرح آ گئیں، بھائی نے مزا تم کو ہوں، پر شتابا۔ بھائی بھی تم [illegible] نہیں کہ لیکن میں تو اسی شہر میں رہتی ہوں۔ ہفتہ عشرہ میں ملنے کا موقع ملتا رہتا ہے [illegible] اچھی نظر آتی ہے۔

یہ تم سے آج سے نہیں ہمیشہ سے جلتی ہے۔

حمیدہ: یہ کیا کہہ رہی ہو؟

تنویر: خدا کی قسم سچ!

حمیدہ: ہوگا بھی، ہم نے تو یہ بات آج سنی ہے۔

تنویر: تو یہ سچ کہنا کیا محسوس بھی آج ہی کیا ہے؟

حمیدہ: اگر محسوس بھی کیا ہے تو آپ سے پہلے کبھی اس کا وہم بھی نہیں گزرا ہے۔

تنویر: تمہارے پیچھے جب کبھی تمہارا ذکر آیا، اس نے ہمیشہ کوئی نہ کوئی جلی کٹی بات کہہ دی۔ غصہ آتا تھا، لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتی تھی کہ بگاڑ کرنے سے کیا فائدہ، یہ تمہیں کچھ نقصان پہنچا نہیں سکتی اور پھر تم بھی اپنی بھابی پر اس طرح صدقے اور قربان ہوا کرتی تھیں کہ اگر میں کچھ کہتی تو شاید سمجھ بیٹھتیں مجھ سے۔

حمیدہ: ہاں تو یہ سچ کہتی ہو۔ اب سے پہلے اگر تم نے ایسی بات کبھی کہی ہوتی، واقعی لڑائی ہو جاتی ہم میں تم میں۔

تنویر: لیکن ہوا کیا، یہ تو بتاؤ؟

حمیدہ: کیا کرو گی یہ کہانی سن کر، بس اتنا بتا دو، میری مدد کر سکتی ہو یا نہیں؟

تنویر: مدد ۔۔۔۔ حمیدہ تمہارے لئے جان بھی دے سکتی ہوں۔

حمیدہ: بخشو، مجھے جان نہیں چاہئے، صرف ایک چھوٹا سا کام۔

چاہیے۔"

تنویر: لیکن کیوں؟

حمیدہ: رہوں گی اور کیوں

تنویر: یہاں کیا تکلیف ہے؟"

حمیدہ: نہ بھئی، پھر بھی اپنی جگہ اپنی ہی ہوتی ہے۔

تنویر: کیا بھائی جان نے ڈاکٹر صاحب سے اجازت لے لی ہے؟"

حمیدہ: نہیں تو۔

تنویر: کیا وہ اجازت دے دیں گے؟

حمیدہ: جانے والے کو کون روک سکتا ہے؟ اور پھر میں ان سے اجازت کیوں لینے لگی؟

تنویر: لیکن انہوں نے پوچھا تو کیا کہو گی؟

حمیدہ: کہہ دوں گی کہ شاہد کا اسکول یہاں سے بہت دور پڑتا ہے۔ بیچارا بچہ پیدل جاتا ہے۔ پیدل آتا ہے تھک کے چور چور ہو جاتا ہے۔ وہاں سے اسکول قریب ہے ——

اور بات بھی یہی —— ہے۔

تنویر: لیکن یہ نہ بتاؤ گی اس گھر کو چھوڑنے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟"

حمیدہ: بتا دوں گی کبھی۔

تنویر: ہم تو ابھی پوچھیں گے —— بتاؤ!

حمیدہ نے سارے واقعات پوری تفصیل سے بتا دیے،

یہ باتیں سن کر تنویر نے کہا:

یہ بات ہے —— میں سمجھ گئی۔ نوشابہ کی قسمت کے پھوڑنے کے سامان ہو رہے ہیں۔

حمیدہ: ابھی سے اس کی شادی کا دکھ؟

تنویر: ماشاء اللہ اب سیانی ہو چکی ہے۔ لڑکی کو عورت بنتے دیر نہیں لگتی۔ مرد برسوں میں بڑھتے ہیں لڑکیاں دنوں میں۔ لیکن چاہیے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ مگر نوشابہ پر رشیدہ حکومت نہیں کر سکیں گی۔"

حمیدہ: حکومت کا کیا سوال ہے؟ انہوں نے تو بیٹی بنا لیا ہے اسے۔"

تنویر: بیٹی بنا لیا ہے؟ —— ارے یہ ظالم عورت ہے۔ نوشابہ زہر کھانے لگی دیکھ لینا!"

حمیدہ: خدا نہ کرے، ایسی باتیں نہ کرو تنویر!

تنویر: میں جھوٹ نہیں کہتی۔

حمیدہ: ہو گا بھئی! ہم کسی کے معاملے میں کیسے دخل دے سکتے ہیں!

تنویر: دیکھیے! وہ ہمارے بھائی کی لڑکی ہے۔ آنکھوں دیکھے مکھی نہیں نگلی جا سکتی

حمیدہ: خیر جب وقت آئے گا، دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو مکان کی بات کرو۔

تنویر: مل تو جائے گا۔

حمیدہ: کب تک —— مجھے جلد سے جلد چاہیے۔

آج مل جائے تو آج ہی یہاں سے رخصت ہو جاؤں۔ اب ایک پل بھی یہاں ٹھہرنا شاق گزر رہا ہے۔

تنویر: کل شاہد کو بھیجنا، ایک مکان قریب ہی ہے۔ شاید ہے مل جائے گا۔ نہ ملے تو کچھ دن میرے یہیں ٹھہر جانا پھر اطمینان سے تلاش کرلیں گے کوئی معقول گھر۔

حمیدہ: نہیں تنویر یہ نہیں ہو سکتا یہ مناسب نہیں ہے۔ اس طرح بات رسوا ہو جائے گی۔ یہاں سے مجھے اپنے مکان ہی میں جانا چاہیے۔ وہاں سے تمہارا گھر کچھ دور تو ہوگا نہیں جب چاہوں جا سکتی ہوں، تم جب چاہو میرے پاس آ سکتی ہو۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کھانا لے کر رشیدہ تشریف لائیں۔ آتے ہی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ پاندان کھینچ کر اپنی طرف بڑھایا اور چھالیا کترنا شروع کردیا۔ پھر تنویر سے کہا۔

کتنی دیر سے کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے تمہارے انتظار میں۔

وہ بولی: میں تو بھائی صاحب کے ساتھ کھاؤں گی!

رشیدہ نے بتایا: ارے وہ تو بلا رہے ہیں، ابھی کی بھیجی ہوئی آئی ہوں۔ ہاتھ دھوتے ہی پوچھا تنویر کہاں ہے، معلوم ہوا سرکار ادھر تشریف رکھتی ہیں بس حکم صادر فرمایا، جاؤ جلد لاؤ انہیں۔

تنویر نے مذاق کرتے ہوئے کہا: لیکن یہ خبر تو جلدی دی تم نے، دو چار پان اور کھا لیتیں پھر کہتیں تو ایک بات بھی تھی۔

اتنے میں نوشابہ آ گئی۔ ڈری ہوئی، سہمی ہوئی۔ اس نے آتے ہی تنویر سے کہا:۔



چلئے ابا جان بلا رہے ہیں آپ کو۔

اور یہ کہتے ہی بڑی تیزی سے واپس جانے کے لئے مڑی۔

تنویر نے آواز دی:۔

نوشابہ یہاں آؤ!

وہ سہمی، ڈری سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

اب بد تمیز بھی ہو گئی ہو، نہ سلام نہ آداب، یہ تمہاری پھپھی جان بیٹھی ہیں، ان سے بات بھی نہ کی؟

رشیدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے نوشابہ کا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا۔

چل لڑکی!"

پھر تنویر سے کہا:۔

جلدی آؤ بھئی!

اور پھر نوشابہ کو اپنے ساتھ لئے ہوئے چلی گئی۔

حمیدہ نے کہا۔

دیکھ لیا تم نے؟

تنویر بولی:۔

ہاں دیکھ لیا۔

حمیدہ: اب تو مانو گی میں نے غلط نہیں کہا تھا۔

تنویر: ہاں مان لیا ــــــ واقعی یہاں رہنا مناسب نہیں۔ دق ہو جاؤ گی رہتے رہتے۔

جلد ہی مکان کا انتظام کرتی ہوں۔

حمیدہ: بڑا احسان ہوگا تمہارا۔ میرے حال پر، بس جس قدر

جلد ہو سکے مکان کا بندوبست کردو۔"

اتنے ہی جھوندا آگیا۔ اس نے کہا:

"سرکار بلا رہے ہیں، جلدی چلئے!"

تنویر اٹھتی ہوئی بولی:

"چلو چلو میں آئی!"



# نیا گھر

دوسرے دن صبح ہی صبح، تنویر کا ملازم پہنچا۔ تنویر نے کہلایا تھا، تمہارے موافق کا مکان مل گیا ہے۔ آؤ دیکھ لو آکر۔ تمیدہ فوراً تنویر کے ہاں پہنچی۔ تنویر نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور کہا، چلو سب سے پہلے تمہیں مکان دکھا لائیں۔

تنویر کے گھر سے متصل، ایک چھوٹا سا مکان تھا، تین کمرے، چھوٹا سا صحن، ایک برآمدہ، باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ الگ۔ کرایہ تیس روپے ماہوار تھا۔

تمیدہ نے مکان پسند کرلیا۔ تنویر نے کہا: "لیکن کرایہ بہت ہے۔" تمیدہ بولی: "بہت تو ہے، مگر یہاں رہوں گی تو کرایہ بھی آسانی سے نکل آئے گا۔" تنویر نے پوچھا: "وہ کس طرح؟"

تنویر: لیکن کیوں؟

حمیدہ: حالات کا تقاضہ یہی ہے

تنویر: شاید تم بھی بھائی جان (ڈاکٹر صاحب) کے تقاضوں سے خفا ہو گئی، لیکن ان بے چارے پر بس آتا ہے۔ صبح سے شام تک کتنی مصروفیت کی زندگی گزارنا پڑتی ہے انہیں تو۔"

حمیدہ: ہاں جانتی ہوں! ——— مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے!

تنویر: تو پھر حمیدہ بیگم سے لڑائی ہوئی؟ بڑی بس کی پڑیا ہے۔ یہ عورت بھی، دور سے دیکھیں تو نیک، انکساری باتیں سنئے تو سراپا اخلاق، ذرا قریب سے دیکھئے تو تنگ دل، تنگ ظرف، حاسد، زرپرست!

حمیدہ: تم نے تو بڑے بڑے خطاب دے ڈالے بے چاری کو۔"

تنویر: لیکن ان میں سے ایک بھی غلط فہمی یا مبالغہ کا شاہکار نہیں ہے — تم نے اس عورت کو دور سے دیکھا ہے، میں نے قریب سے دیکھا ہے۔"

حمیدہ: بہت خوب ایک نقطہ نکالا ہے تمہاری تنویر نے۔

تنویر: غلط نہیں کہتی، شادی کے بعد تم ان کے ساتھ ایک [illegible] دوسرے شہر کے [illegible] کاٹی ہیں، کسی مہمانوں کی طرح آ گئیں۔ بھائی [illegible] میرا گھر [illegible] تھا۔ بھائی [illegible] لیکن میں تو اسی شہر میں رہتی ہوں۔ [illegible] ملنے کا موقع [illegible] کبھی [illegible] اچھی نظر آتی ہیں۔



پھر حمیدہ کے غم خانہ میں پہنچ گئی۔ حمیدہ نے دیکھتے ہی شکایت آمیز لہجہ میں کہا:—

"بڑی بے مروت ہو اب آئی ہو تم؟"

تنویر پاس بیٹھتے ہوئے بولی:"

تو کونسا ایسا ضروری کام تھا کہ ذرا دیر ہو گئی تو قیامت پڑ گئی؟ بتاؤ۔ کیا بات ہے...؟

حمیدہ: چلو! جاؤ نہیں بتاتے۔

تنویر: اچھا تو [illegible] بھی ہوئی، تو معاف کیجئے بیگم صاحبہ، مجھ سے گستاخی سرزد ہو گئی تو پھر شکایت نہ کیجئے گا، عرض کئے دیتی ہوں! ———

حمیدہ مسکرانے لگی۔ تنویر نے پوچھا:"

واقعی کوئی خاص بات ہے؟

حمیدہ: ہاں بڑی خاص بات، ذرا سنجیدہ ہو تو کہوں۔

تنویر: میری فکر نہ کرو، ہر وقت سنجیدہ ہو سکتی ہوں، لو ہو گئی، اب کہو

حمیدہ: کیا تمہارے محلے میں، تمہارے گھر سے قریب کوئی چھوٹا سا سستا سا مکان مل سکتا ہے؟

تنویر: ایک نہیں کئی ——— لیکن کیا کرو گی؟ کیا رہنا ہے وہاں؟

حمیدہ: ہاں تنویر! یہی فیصلہ کیا ہے میں نے۔

تنویر: (اضطراب کے ساتھ) کیا واقعی؟

حمیدہ: ہاں سچ مچ ہاں!

یہ تم سے آج سے نہیں ہمیشہ سے جلتی ہے ۔

حمیدہ: یہ کیسا کہہ رہی ہو؟

تنویر: "خدا کی قسم سچ!

حمیدہ: ہوگا بھی! ہم نے تو یہ بات آج سنی ہے۔"

تنویر: تو پھر سچ کہنا کیا محسوس بھی آج ہی کیا ہے۔؟

حمیدہ: اگر محسوس بھی کی ہے تو اب سے پہلے کبھی اس کا وہم بھی نہیں گزرا ہے

تنویر: تمہارے پیچھے جب کبھی تمہارا ذکر آیا، اس نے ہمیشہ کوئی نہ کوئی جلی کٹی بات کہہ دی۔ غصہ آتا تھا، لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتی تھی کہ تکرار کرنے سے کیا فائدہ؟ یہ تمہیں کچھ نقصان پہنچا نہیں سکتی اور پھر تم بھی اپنی بھابی پر اس طرح صدقے اور قربان ہوا کرتی تھیں کہ اگر میں کچھ کہتی تو شاید بگڑ بیٹھتیں مجھ سے ۔

حمیدہ: ہاں تو سچ کہتی ہو۔ اب سے پہلے اگر تم نے ایسی بات کہی ہوتی، واقعی لڑائی ہو جاتی ہم میں تم میں۔

تنویر: لیکن ہوا کیا، یہ تو بتاؤ؟"

حمیدہ: کیا کروگی یہ کہانی سن کر۔ بس اتنا بتا دو: میری مدد کر سکتی ہو یا نہیں؟

تنویر: مدد —— ، حمیدہ تمہارے لئے جان بھی دے سکتی ہوں —

حمیدہ: بخشو، مجھے جان نہیں چاہئے، صرف ایک چھوٹا سا کام چاہیے۔"

تنویر: لیکن کیوں؟

حمیدہ: رہوں گی اور کیوں

تنویر: یہاں کیا تکلیف ہے؟"

حمیدہ: نہیں، پھر بھی اپنی جگہ اپنی ہی ہوتی ہے۔

تنویر: کیا بھائی جان نے ڈاکٹر صاحب سے اجازت لے لی ہے ؟"

حمیدہ: نہیں تو۔

تنویر: کیا وہ اجازت دے دیں گے؟

حمیدہ: جانے والے کو کون روک سکتا ہے؟ اور پھر میں ان سے اجازت کیوں لینے لگی؟

تنویر: لیکن انہوں نے پوچھا تو کیا کہوگی؟

حمیدہ: کہہ دوں گی رخشندہ کا اسکول یہاں سے بہت دور پڑتا ہے۔ بیڑا بچہ پیدل جاتا ہے۔ پیدل آتا ہے تھک کے چور چور ہو جاتا ہے۔ وہاں سے اسکول قریب ہے —— اور بات بھی یہی —— ہے —

تنویر: لیکن یہ نہ بتاؤ گی اس گھر کو چھوڑنے کا فیصلہ کیوں کیا ہے"

حمیدہ: بتا دوں گی کبھی —

تنویر: ہم تو ابھی پوچھیں گے —— بتاؤ!

حمیدہ نے سارے واقعات پوری تفصیل سے بتا دیئے، یہ باتیں سن کر تنویر نے کہا:

یہ بات ہے ـــــ میں سمجھ گئی۔ نوشابہ کی قسمت کے پھوڑنے
کے سامان ہو رہے ہیں۔
حمیدہ: ابھی سے اس کی شادی کا دکھ؟
تنویر: ماشاءاللہ اب جوانی ہو چکی ہے۔ لڑکی کو عورت بنتے دیر نہیں لگتی۔ مرد برسوں میں بڑھتے ہیں لڑکیاں دنوں میں۔ لیکن چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ مگر نوشابہ پر رشیدہ حکومت نہیں کر سکیں گی۔"
حمیدہ: حکومت کا کیا سوال ہے، دلہن ملے تو بیٹی بنا لیا ہے اسے۔"
تنویر: بیٹی بنا لیا ہے؟ ـــــ ارے یہ ظالم عورت ہے۔ نوشابہ زہر کھانے لگی دیکھ لینا!"
حمیدہ: خدا نہ کرے ایسی باتیں نہ کرو تنویر!
تنویر: میں جھوٹ نہیں کہتی۔
حمیدہ: ہوگا بھئی! ہم کسی کے معاملے میں کیسے دخل دے سکتے ہیں!
تنویر: دیکھئے، وہ ہمارے بھائی کی لڑکی ہے۔ آنکھوں دیکھے مکھی نہیں نگلی جا سکتی۔
حمیدہ: خیر جب وقت آئے گا، دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو مکان کی بات کرو۔
تنویر: وہ تو مل جائے گا۔
حمیدہ: کب تک؟ ـــــ مجھے جلد سے جلد چاہئے۔



آج مل جائے تو آج ہی یہاں سے رخصت ہو جاؤں۔ اب ایک پل بھی یہاں ٹھہرنا شاق گزر رہا ہے۔
تنویر: کل شاہد کو بھیجا، ایک مکان قریب ہی ہے۔ امید ہے مل جائے گا۔ نہ ملے تو کچھ دن میرے یہاں ٹھہر جانا۔ اطمینان سے تلاش کر لیں گے کوئی معقول گھر۔
حمیدہ: نہیں تنویر یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ اس طرح بات رہ جائے گی۔ یہاں سے مجھے اپنے مکان ہی میں جانا چاہئے۔ وہاں سے تمہارا گھر کچھ دور تو ہوگا نہیں، جب چاہوں جا سکتی ہوں، تم جب چاہو میرے پاس آ سکتی ہو۔"
یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کھانستی رشیدہ بیگم تشریف لائیں۔ آتے ہی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ پاندان کھینچ کر اپنی طرف بڑھایا اور چرنا شروع کر دیا۔ پھر تنویر سے کہا۔
کتنی دیر سے کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے تمہارے انتظار میں۔
وہ بولی: میں تو بھائی صاحب کے ساتھ کھاؤں گی!
رشیدہ نے بتایا: ارے وہی تو بلا رہے ہیں، انہی کی بھیجی ہوئی آئی ہوں۔ بات ٹالتے ہی پوچھا تنویر کہاں ہے۔ معلوم ہوا سرکار ادھر تشریف رکھتی ہیں۔ بس حکم صادر فرمایا، جاؤ جلد لاؤ اسے۔
تنویر نے مذاق کرتے ہوئے کہا، لیکن یہ خبر بڑی جلدی دی تم نے، دو چار پان اور کھا لیتیں پھر کہتیں تو ایک بات بھی تھی۔
اتنے میں نوشابہ آ گئی۔ ڈری ہوئی سہمی ہوئی۔ اس نے آہستہ
بی تنویر سے کہا:۔

چلئے ابا جان بلا رہے ہیں آپ کو۔

اور یہ کہتے ہی بڑی تیزی سے واپس جانے کے لئے مڑی۔

تنویر نے آواز دی:-

نوشابہ یہاں آؤ!

وہ سہمتی، ڈرتی سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

اب بدتمیز بھی ہوگئی ہو، نہ سلام نہ آداب، یہ تمہاری بھیجی جان بیٹھی ہیں ان سے بات بھی نہ کی؟

رشیدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے نوشابہ کا ہاتھ سے پکڑ لیا۔

چل لڑکی!"

پھر تنویر سے کہا:-

جلدی آؤ بھئی!

اور پھر نوشابہ کو اپنے ساتھ لئے ہوئے چلی گئی۔

حمیدہ نے کہا:-

دیکھ لیا تم نے؟

تنویر بولی:-

ہاں دیکھ لیا۔

حمیدہ: اب تو مانوگی میں نے غلط نہیں کہا تھا۔

تنویر: ہاں مان لیا ــــــــ واقعی یہاں رہنا مناسب نہیں۔ دق ہوجائے گی مجھتیں۔

جلدی ہی مکان کا انتظام کرتی ہوں۔

حمیدہ: "بڑا احسان ہوگا تمہارا۔ میرے حال پہ، بس جس قدر



جلد ہوسکے مکان کا بندوبست کردو۔"

اتنے میں عبوندا آگیا۔ اس نے کہا:

"سرکار بلا رہے ہیں، جلدی چلئے!

تنویر اٹھتی ہوئی بولی:-

چلو چلو میں آتی!"

## نیا گھر

دوسرے دن صبح ہی صبح، تنویر کا ملازم پہنچا۔ تنویر نے کہلا بھیجا تھا "بڑے موقع کا مکان مل گیا ہے۔ آ کر دیکھ لو۔" حمیدہ فوراً تنویر کے ہاں پہنچی۔ تنویر نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور کہا، "چلو سب سے پہلے تمہیں مکان دکھا لائیں۔"

تنویر کے گھر سے متصل، ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ تین کمرے، چھوٹا سا صحن، ایک برآمدہ، باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ الگ۔ کرایہ تیس روپے ماہوار تھا۔

حمیدہ نے مکان پسند کر لیا۔ تنویر نے کہا: "لیکن کرایہ بہت ہے۔" حمیدہ بولی: "بہت تو ہے، مگر یہاں رہوں گی تو کرایہ بھی آسانی سے نکل آئے گا۔" تنویر نے پوچھا: "وہ کس طرح؟"

حمیدہ نے بتایا کہ قاسم کا چھوڑا ہوا روپیہ تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ اب اس پر گزر نہیں ہو سکتی۔ یہاں آ کر سینے پرونے کا کام بھی اطمینان سے کروں گی۔ اور پچاس ساٹھ روپیہ ماہوار کما لیا کروں گی۔ بھائی صاحب کے ہاں رہ کر تو یہ کام نہیں کر سکتی۔ وہ برا مانیں گے اور گھر کے لوگ الگ طعنے دیں گے۔ میں اپنے بھائی کو ذلیل کرنا نہیں چاہتی۔ لوگ ان کا بھی مذاق اڑائیں گے کہ بیوہ بہن سلائی پر بسر کر رہی ہے۔ بھائی ہزاروں ماہوار کماتا ہے اور خرچ بھی نہیں دیتا۔ کیوں رسوا کروں اپنے بھائی کو! یہاں نہ کوئی دیکھنے والا ہوگا نہ پوچھنے والا۔

حمیدہ کی باتیں سن کر تنویر کی آنکھیں بھر آئیں، لیکن بہت جلد وہ اپنی اس کیفیت پر غالب آ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک آنسو بھی اگر ڈھلکا تو حمیدہ کی خودداری کو ٹھیس لگے گی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی، خوددار اور بے باک آزاد کسی طرح نہیں برداشت کر سکتی۔ بات کا رخ بدلتے ہوئے اس نے کہا:

"تمہیں سلائی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

حمیدہ: "بہن ——— نہ بولو تم اس کام پر آمادہ کیوں ہوئی؟ ——— میں نے آج تک بھائی صاحب سے ایک پیسہ نہیں لیا۔ میں کسی کی مدد نہیں قبول کر سکتی۔ دوسروں کے سہاروں پر گزر بسر کرنا میرے لئے ذلیل بات ہے۔ اپنی محنت سے روکھی روٹی کھانا بہت بڑی نعمت ہے۔"

تنویر: "ہاں بی بی! جانتی ہوں تیری آزادگی کو ——— میں نہیں کہتی کہ اپنی خودداری کا خمیازہ بھگتو، نہ کہتی

ہوں کہ میری پا بھابی جان (ڈاکٹر) کی مدد قبول کرو۔ جانتی ہوں یہ نہیں کر دگی۔ میرے ذہن میں ایک اور ترکیب ہے

حمیدہ :۔ وہ کونسی ترکیب ہے ؟

تنویر :۔ یہاں ایک چھوٹا سا مدرسہ کھول لو لڑکیوں کا، خاصی آمدنی ہو جایا کرے گی "

حمیدہ :۔ تجویز تو معقول ہے ـــــــ لیکن اس نئے محلے میں مجھے جانتا کون ہے، کون اپنی لڑکی بھیج دے گا ؟

تنویر :۔ یہ مجھ پر چھوڑ دو "

حمیدہ :" تو پھر مجھے اس تجویز سے بالکل اتفاق ہے ۔

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں دونوں میں ہوتی رہی ۔ پھر حمیدہ جانے کے لئے اٹھی ۔ اس نے کہا ۔ "

اب اجازت دو ۔

تنویر نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا :

واہ! کہیں ایسا ہو سکتا ہے ؟

حمیدہ :۔ دیر ہو رہی ہے ۔

تنویر :۔ کھانا کھا کر جانا ۔

حمیدہ واہ! ـــــــ وہاں میرا بچہ شاہد لوٹ لگ کرتا آتا ہوگا ۔

تنویر :۔ اس کی فکر مت کرو ۔

حمیدہ :۔ یہ کیوں ؟

تنویر :۔ میں نے آدمی سے کہلا دیا ہے ۔ اسکول سے سیدھا

یہیں آئے گا ـــــــ ارے لو، بڑی عمر، آگیا ۔

آؤ بیٹے شاہد آ جاؤ جلدی سے "

حمیدہ مسکرا پڑی :

بڑی شریر ہو! "

اتنے میں شاہد آگیا ۔ تنویر نے پیار سے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا :۔

پسینہ پسینہ ہو رہا ہے !"

حمیدہ بولی :

دھوپ بھی کتنی تیز ہے !

تنویر نے پوچھا :۔

روز پیدل جاتا ہے اسکول گھر سے ؟ وہ تو بہت دور ہے وہاں سے ۔

حمیدہ بولی :۔

ہاں ! اسی لئے تو یہ گھر لے رہی ہوں، میرا بچہ ہلکان ہو جاتا ہے آتے جاتے !"

شاہد نے ایک خشک تبسم کے ساتھ، اپنے پپڑی پڑے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا :۔

کیا مکان لے لیا گیا آپ کو ؟"

حمیدہ نے تنویر کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا ۔

" ہاں بیٹے ـــــــ "

## ملمع

حمیدہ اپنے چھوٹے سے گھر میں منتقل ہو گئی۔

اسے اندیشہ تھا، گھر چھوڑتے وقت ڈاکٹر صاحب ضرور آڑے آئیں گے اور کسی نہ کسی حد تک نقل مکانی میں دشواری پیش آئے گی، لیکن خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کو دو روز کے لیے شہر سے باہر ایک مریض کو دیکھنے جانا پڑا۔ ان کی عدم موجودگی میں یہ منزل آسان ہو گئی۔ جب اس کا سامان جانے لگا تو حسینہ اور رشیدہ میں کچھ دیر تک کھسر پھسر ہوئی۔ پھر دونوں حمیدہ کے پاس آئیں۔ حسینہ نے پوچھا:-

"حمیدہ! کیا واقعی یہ گھر چھوڑ رہی ہو تم؟"

حمیدہ نے جواب دیا:

"ہاں بھابی!"

حسینہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"اتنی بے مروت نکلو گی، یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔"

حمیدہ: "بھابی! اس میں بے مروتی کی کیا بات ہے، اپنے اپنے حالات ہوتے ہیں اور اس کا لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

حسینہ: "ہاں یہ ٹھیک ہے، لیکن حالات ایسے تو نہیں ہوئے تھے کہ ناخن کو گوشت سے جدا کر دیں۔ ایک گھر میں برتن بھی ساتھ رکھے جاتے ہیں تو کھنک جاتے ہیں۔ ہم تم تو آدمی ہیں، ممکن ہے تمہاری کوئی بات مجھے ناگوار گزری ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے میری کوئی بات تمہیں ناپسند ہوئی ہو۔ یہ تو زندگی میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس سے ہمیشہ کے لئے جدائی تو نہیں ہو جاتی!"

حمیدہ: "گھر چھوڑنے کے معنی یہ تو نہیں کہ میرا آپ کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ وہ تو جان کے ساتھ ہے۔ انشاء اللہ آتی رہوں گی، آپ کو بھی بلایا کروں گی، ہاں اگر میرے بلانے پر آپ نہ آئیں، تو بے شک لڑائی ہوگی مجھ میں آپ میں۔"

حسینہ: "لیکن اتنی جلدی کیا ہے، دو چار روز کے بعد چلی جانا۔"

حمیدہ: "نہیں بھابی!"

حسینہ: "میرا مطلب یہ ہے تمہارے بھائی تو آ جائیں۔ وہ آ کر سب سے پہلے تم ہی کو پوچھیں گے، اور تمہیں نہ پا کر مجھ غریب پر برس پڑیں گے۔"

حمیدہ: "نہیں بھابی! ایسا نہیں ہوگا۔"

حسینہ: "کیسے نہیں ہوگا، کچھ تم یہاں سمجھی ہو گی!"

حمیدہ: "بلا بھیجے گا، تو ناآجاؤں گی"
رشیدہ: جب فتنہ سر اٹھائے گا، تب آجاؤ گی۔ آخر دو دن تک جانے میں کیا قباحت ہے۔"
حمیدہ: "پھر مکان ہاتھ سے نکل جائے گا"
رشیدہ: "اور بہت سے مل جائیں گے"
حمیدہ: "ایسا موقع کا نہیں ملے گا"
رشیدہ: "تم جانو بھئی، ہم نے جو سمجھانا تھا سمجھا دیا"
حمیدہ: "میں آپ کی شکر گزار ہوں"
رشیدہ: "معاف کر دی بی۔ بازآئی میں اپنا شکریہ ادا کرانے سے اگر میری وجہ سے جا رہی ہو تو بندی یہ چلی، تم رہو سکھ سے یہاں"
حمیدہ: میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کہی۔
رشیدہ: لیکن سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں، بات کا مقصد کیا ہے؟
حمیدہ: سمجھ جاتے ہوں گے۔ ________ اچھا بھابی اب اجازت دیجئے۔
حسینہ: کہا مان لو حمیدہ، ابھی نہ جاؤ۔"
حمیدہ: زیادہ اصرار کر کے شرمندہ نہ کیجئے بھابی!
حسینہ: بڑی ضدی ہو میں نے پہلے ہی رشیدہ سے کہہ دیا تھا وہ نہیں مانے گی، لیکن یہ بھلی ہو لی تھی کہ نہیں چلو رک جائیں (حمیدہ کو رشیدہ سے) دیکھ لیا تم نے وہی ہوا نا، جو میں نے کہا تھا؟"

رشیدہ: (ٹھنڈی سانس لے کر) "تم جانو، یہ جانیں، ہم بیچ میں بولنے والے کون؟
اتنے میں شنا بدا آگیا، اس نے کہا:
"تانگے والا بگڑ رہا ہے کہتا ہے اتنی دیر ہو گئی اب تک سواری ہی نہیں آچکی، میں جاتا ہوں ________ بڑی مشکل سے اسے روک کر آیا ہوں۔"
حمیدہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا:
"چلو، چل رہی ہوں!"
حسینہ نے شنا بد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:
"کیوں رے بے مروت جا رہا ہے اور ہم سے بات بھی نہیں کرتا!"
شنا بد کچھ جھینپ سا گیا کوئی جواب نہیں دیا، مسکرانے لگا۔
اتنی دیر میں حمیدہ آگے بڑھ چکی تھی، حسینہ اور رشیدہ اسے دروازے تک چھوڑنے کے لئے روانہ ہوئیں۔ حمیدہ جب حسینہ کے کمرے کے سامنے پہنچی تو نوشابہ تیزی سے باہر نکلی اور حمیدہ کے پاؤں سے لپٹ گئی۔ اس نے زار روتے ہوئے کہا:
"اچھی میری پھوپھی نہ جایئے!"
حمیدہ نے اسے گلے سے لگا لیا، پیار کرنے لگی اور سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور شفقت آمیز لہجے میں کہا:
"بچی! شہر سے باہر نہیں تھوڑے جاتی ہوں، یہاں ذرا تکلیف تھی اس لئے دوسرا مکان لے لیا ہے۔ آیا کروں گی، آتی رہوں گی، بھابی سے وعدہ لے لیا ہے، وہ بھی ہمارے ہاں آیا کریں گی۔ تم بھی ان

ساتھ آیا کرنا۔"

لیکن ان باتوں سے اس کی تسلی نہیں ہوئی، وہ بدستور روئے جارہی تھی اور کہہ رہی تھی ؛۔

"امی میری پھپھی آپ نہ جائیے!"

روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ یہ وہی لونشاہ تھی جس کے ذرا سے اشارہ پر حمیدہ کا بندھا ہوا بستر کھل جایا کرتا تھا، آج وہی اس طرح بلک بلک کر رو رہی تھی، لیکن حمیدہ مجبور تھی کہ اپنے ارادہ پر قائم رہے اس لئے ایک مرتبہ پھر اسے پیار کیا اور کہا۔"

"بچی! زیادہ نہیں روتے، چپ رہو!"

لیکن اس کا رونا بدستور جاری تھا۔ حسینہ کی آنکھوں میں لونشاہ کی اس بے تکلفی سے خون اتر آیا تھا اور کوئی وقت ہوتا، تو وہ ابھی اس کی تادیب اور تنبیہ شروع کر دیتی لیکن عقلمند تھی، موقع مصلحت کو سمجھتی تھی۔ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ کچھ نہ کہا۔ حمیدہ نے آخری مرتبہ چلتے چلتے ایک مرتبہ پھر لونشاہ کو گلے سے لگا لیا۔ وہ بچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ سر تھپکتے ہوئے اس نے کہا۔

"پھپھی جان! مجھے بھی اپنے ساتھ لیتی چلئے، میں یہاں نہیں رہونگی"

یہ الفاظ نہیں تھے بم کا گولہ تھے۔ اب تو حسینہ اور رشیدہ دونوں کے لئے ضبط کرنا ناممکن ہو گیا۔ حسینہ نے گرجتے ہوئے کہا

"بڑی بدتمیز ہو گئی ہو لونشاہ! اس طرح رو رو کر بدشگونی نہ کرو۔ جانے دو حمیدہ کو!"

یہ الفاظ جیسے ہی اس کے کان میں پڑے، دفعتہً وہ سنبھل گئی،



گویا اب تک جو کچھ وہ کہہ رہی تھی، کہہ رہی تھی اور مدہوشی کا عالم تھا۔ لیکن حسینہ کے الفاظ سنکر وہ ہوش میں آگئی۔ وہ حمیدہ کے پاس سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی زبان بند کر لی۔ اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے برابر آنسو گر رہے تھے۔ ہچکیوں کا سلسلہ کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر حمیدہ کا کلیجہ پھٹ گیا۔ وہ خود بھی رونے لگی۔ اگر ایک منٹ بھی اور ٹھہرتی تو شاید پچھاڑ کھا کر گر پڑتی، بے ہوش ہو جاتی۔ اس نے حسینہ اور رشیدہ کو کانپتے ہاتھوں سے سلام کیا اور کلیجہ پر پتھر کی سل رکھ کر ہچکیاں کھاتی، گرتی پڑتی، روتی بلکتی اپنے نئے گھر کی طرف بصد حسرت و یاس روانہ ہو گئی!

# نوشابہ

حمیدہ کے جاتے ہی حسینہ اور رشیدہ کا ملمع اتر گیا۔ حسینہ نے نم آلود نظروں سے گھور کر اسے دیکھا۔ وہ اب تک یوں ہی مکلتیب حجاب کھڑی تھی۔ اب تک اس کی آنکھوں سے قطرات اشک کا سیلاب جاری تھا۔ اب تک وہ سارے بدن سے کانپ رہی تھی۔ ہچکیوں اور سسکیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ حسینہ نے اس کا ہاتھ زور سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا:

"کیوں ری حرافہ! یہ کیا! کمبخت جانے تجھے تو نے؟"

رشیدہ نے بیچ میں ٹوکتے ہوئے کہا۔

"یا کمبخت کیوں تجاہل؟ اپنی پھوپھی سے محبت کرتی ہے وہ جانے تئیں ہمیں کو رونا آگیا۔ اس میں خفا ہو سکتی کیا اسے



حسینہ نے ڈانٹا!۔

"یہ ان کے ساتھ جانے کو بھی تو کہہ رہی تھی!"

رشیدہ نے بات بنائی:۔

"بچے اس طرح کی باتیں کیا ہی کرتے ہیں"

حسینہ نے دانت پیستے ہوئے نوشابہ کو گھسیٹ کر اور زیادہ اپنے سے قریب کر لیا اور کہا!

"ہزار دفعہ ان باتوں سے منع کر چکی ہوں، لیکن یہ مجھ سے نفرت کرتی ہے، حمیدہ پر جان دیتی ہے! ——"

"کیوں ری؟"

یہ کہہ کر نوشابہ کا ہاتھ چھوڑ دیا، چوٹی پکڑ کر اس کے سر کو جھٹکا دیا۔ جب اس کا منہ سامنے آگیا تو بڑے زور کا ایک چانٹا لگایا اور کہا!

"پھر کبھی ایسا کرے گی! پھر کبھی حمیدہ کے ہاں جانے کا نام لے گی۔"

نوشابہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔"

"نہیں ——!"

حسینہ نے چوٹی چھوڑ دی رشیدہ نے جلدی سے اسے اپنے دامن میں چھپا لیا اور تھپکنے لگی۔ دفعتہً دھماکے کی آواز آئی۔ نوشابہ تڑپ گئی۔ حسینہ اور رشیدہ نے غور سے دیکھا تو وہ بے ہوش ہو چکی تھی ——

## الٹے لیٹے

نوشابہ کو بے ہوش دیکھ کر حسینہ اور رشیدہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ دونوں بدحواس ہو گئیں۔ خوش قسمتی دیکھئے کہ شہر کے سب سے بڑے ڈاکٹر کی اکلوتی لڑکی بے ہوش پڑی ہے اور ڈاکٹر کا پتہ نہ تھا۔ رشیدہ نے نوشابہ کو لٹا کر پنکھا جھلنا شروع کیا، ماں نے نمک منگوایا۔ دونوں بہنیں روتی جاتی تھیں اور ہوش میں لانے کی تدبیر کرتی جاتی تھیں۔ بڑی دیر کے بعد اس نے کروٹ بدلی اور پھر آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگی۔ اسے ہوش میں دیکھ کر حسینہ کی باچھیں کھل گئیں۔ جھٹ پٹ بیٹی کی بلائیں لیں اور صدقے کر دینے لگیں۔ رشیدہ نے جلدی سے پانچ روپے کے کئی نوٹ نکالے۔ جو نند اشتہزادی اصغری کو خیرات کے بدلے میں ایک ایک نوٹ عطا فرمایا، پھر دس روپے دے کر کہا۔



مسجد کے ملا کو دے آؤ۔ پھر پانچ روپے کی مٹھائی منگائی اور محلے کے بچوں میں تقسیم کرنے کے لئے شہزادی کے حوالے کر دی۔ بڑے اطمینان کے ساتھ آ کر بچی کے پاس بیٹھ گئیں۔ اور درازیٔ عمر و صحت کی دعا دینے لگی۔ ماں نے بچی سے پوچھا :-

"کیوں بچی اب کیسی طبیعت ہے؟"

وہ کمزور اور نحیف آواز میں بولی :-

"اچھی ہوں!"

رشیدہ نے گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا :-

"کیا ہو گیا تھا میری بچی تجھے؟"

اس نے پھر آہستہ سے مدھم آواز میں کہا :-

"چکر آ گیا تھا، گر پڑی۔ پھر یاد نہیں کیا ہوا!"

حسینہ نے اس کا سر دابتے ہوئے کہا۔ "اچھا بچی سو جا!"

پھر خود بخود انھوں نے تھپک کے کہانی شروع کر دی۔ "ایک تھا بادشاہ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ! آنکھوں کی دیکھی نہیں کہتے، کانوں کی سنی کہتے ہیں۔"

کہانی ختم کر کے حسینہ نے نوشابہ پر جب ایک نظر ڈالی، تو اطمینان کا سانس لیا کیونکہ وہ بے خبر سو چکی تھی۔ اور زیادہ آرام سے لٹا دیا۔ پھر دبے پاؤں کمرہ سے دالان میں آ گئیں، گویا وہ رشیدہ سے کہہ رہی تھیں "بچی سو گئی ہے اسے سونے دو!"

دالان میں آ کر دونوں بہنوں میں باتیں شروع ہو گئیں۔

رشیدہ: "اللہ جانے میرے تو پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

تھی، نوشابہ کو بے ہوش دیکھ کر۔

حسینہ: میرا دل اتنے زور زور سے دھڑکنے لگا کر خود بیہوش ہوتے ہوتے بچی۔"

رشیدہ: - اور کیا ؟ موئی آنکھ کا بھی ایک دیدہ ہے، خدا سلامت رکھے۔!

حسینہ: - آمین ! ________ لیکن رشیدہ ذرا سوچو تو ان باتوں کا انجام کیا ہوگا ؟"

رشیدہ: " وہ تو دیکھ رہی ہوں "

حسینہ: اس جادوگرنی نے کونسا انجنتر پڑھ کر میری بچی پر پھونکا ہے کہ کلمہ پڑھنے لگی ہے اس کا ؟

رشیدہ: ہمیں تو یہ طریقے نہیں آتے "!

حسینہ: لیکن میں نے طے کر لیا ہے چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے، لیکن وہ نہیں ہوگا جو بی حمیدہ چاہتی ہیں "

رشیدہ: " ہاں اور کیا ________ کون ماں اندھے کنوئیں میں لینے باعوض اپنی لڑکی کو دھکیل سکتی ہے ؟"

حسینہ: - بی حمیدہ کو بڑا غرہ ہے اپنے بھائی صاحب پر، انہیں یقین ہے ڈاکٹر صاحب نوشابہ اور شاہد کی آنکھ بچا کر شادی کر دیں گے۔

رشیدہ: ایسا ہوا تو میں زہر کھا لوں گی اور خالد کا گلا گھونٹ دوں گی "

حسینہ: خدا نہ کرے ، ایسی فال بد کیوں منہ سے نکالتی ہو ،



رشیدہ: کچھ بھی ہو جائے، اپنے جیتے جی تو ایسا ہونے نہیں دوں گی۔ خدا رکھے خالد کی ابھی عمر ہی کیا ہے بظاہر تو شاہد سے بڑا معلوم ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ چوڑی ہڈی کاٹھ کا ہے۔ ورنہ چھ مہینے چھوٹا ہے شاہد سے۔

حسینہ: ہاں میں جانتی ہوں!

رشیدہ: تو میں یہ کہہ رہی تھی آپا کہ ابھی خالد کی عمر ہے ۱۵، ۱۶ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ لیکن جہاں اپنی خالہ (حسینہ) اور خالو ڈاکٹر صاحب اپر ہزار جان سے فدا ہے، وہاں نوشابہ کا بھی اتنا خیال رکھتا ہے کہ بس کیا کہوں! پڑھ لکھ کر جہاں میرے پاس آکر بیٹھا بس نوشابہ کی باتیں ہو رہی ہیں کرید کرید کے اس کی باتیں پوچھا کرتا ہے "

حسینہ: ہاں بھئی ! اپنا خون اپنا خون ہوتا ہے ؛"

رشیدہ: لیکن سوچتی ہوں اگر بھائی صاحب (ڈاکٹر صاحب) بہن کی محبت کے جوش میں بہنے سے اکھڑ گئے تو کیا ہوگا ؛

حسینہ: کہیں اکھڑے نہ ہوں ________ لڑکی کی ماں کی جوتی ہے۔ لڑکا باپ کا۔ نوشابہ میری ہے۔ میں ہی جہاں جہاں چاہوں گی اس کی شادی کروں گی۔ اس کے مقابلے میں نہ تمہارے بھائی صاحب دخل دے سکتے ہیں نہ لفٹیننٹ گورنر صاحب۔ لو اور سنو! ہم نے تو اپنی جان مار مار کے لڑکی کو پالا پوسا۔ پروان چڑھایا اور وہ خود اپنے کر دی جائے موئے فقیروں کے "

رشیدہ : وہی تو میں بھی کہتی ہوں، وہ عرا کیا ہے بی حمیدہ کے پاس رہے صاحبزادے۔ تو آپا بچہ کے پاؤں پالنے میں پہچانے جاتے ہیں۔ ایک ہی کور مغز، اور گاؤدی لڑکا ہے۔ کیا تمہیں ابھی ابھی دن لونشابہ کو بتا رہا تھا کہ زمین گردش کرتی ہے۔ مجھے ہنسی آگئی، لیکن چپ رہی۔ بھلا ایسا لڑکا ترقی کر سکتا ہے کبھی؟ پڑھ لکھ کر قابل بن سکتا ہے بھلا؟

حسینہ : ہوں تو یہ کہو۔

رشیدہ : ہماری لونشابہ مزاج کے اعتبار سے ایک نواب زادی ٹھہری بھلا حمیدہ کے محتاج خانے میں وہ سکھ سے رہ سکے گی؟ نادان کی پالی ایک تو لڑکی ہے اور اسے بھی آنکھ بند کر کے بھیڑیئے کے حوالے کر دیں۔ یہ کس دل سے ہو سکتا ہے؟

حسینہ : میں تو کہتی ہوں اچھا ہوا آپا کہ حمیدہ یہاں سے چلی گئی ہے۔"

رشیدہ : اچھا تو ہوا لیکن دیکھ لینا، بھائی صاحب ضرور طوفان کھڑا کر دیں گے!

حسینہ : اٹھایا کریں کوئی طوفان۔ ہم نے تو نکالا نہیں ہے۔ خود سے گئی ہیں بی جی چاہے لے آئیں جا کر بہن کو، کوئی ہم نے روکا ہے، باقی ہم سے ان بہن صاحبہ کا نہ کوئی تعلق تھا، نہ رہے گا۔

لونشابہ کے لئے منہ دھو رکھیں۔"



رشیدہ : تم تو نرے کو کیا سمجھتی ہو۔ حمیدہ تو چاہے چپ رہے، لیکن دیکھ لینا یہ بھائی صاحب کے آتے ہی کیسی لگائی بجھائی کرے گی وہ جلتی ہے ہم سے۔

حسینہ : بھلے، بلکہ جل کر بھسم ہو جائے۔ ہم خوش ہمارا خدا خوش ہمارا خدا خوش۔

رشیدہ : لیکن آپا دشمن کو حقیر نہ سمجھنا چاہیئے۔

حسینہ : تو بھائی سر پر بٹھانے سے رہی۔

رشیدہ نے پاندان کھینچ کر اپنی طرف بڑھایا اور گردن جھکا کر پان بنانے لگی۔"

# تریا چرتر

دو تین دن میں لوٹ پوٹ کر لوبنا بہ ٹھیک ہو گئی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حمیدہ کو بھول چکی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ بہل گئی تھی۔

اس عرصہ میں اس کی اتنی خاطر داری اور ناز برداریاں، ماں اور خالہ کی طرف سے ہوئیں۔ اسے کھانوں اور کھیلوں میں اتنا زیادہ الجھائے رکھا گیا کہ دوسرے امور پر غور کرنے یا سوچنے کی فرصت ملتی ہی نہیں تھی۔ حسینہ نے اپنی پالیسی تبدیل کر لی تھی۔ وہ چاہتی تھی لوبنا بہ حمیدہ کو بھول جائے۔ لیکن یہ خواہش جبر دتور اور مار پیٹ کے بجائے اب پیار اور شفقت کے ذریعہ پوری کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔"

ڈاکٹر صاحب بھی کئی دن کے بعد بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں جیب میں ٹھونسے تشریف لائے۔ انہوں نے اپنے مریض کو موت کے پنجہ سے چھین لیا تھا۔ اس لئے خوشی میں تھیلیوں کے منہ کھول



ویسے بھی حسینہ ان کی خاطر داشت اور راحت و آرام کا بڑا خیال رکھتی ہے لیکن اس مرتبہ خاص طور پر اہتمام کے ساتھ نوازشوں کی بھرمار کی گئی۔ تاکہ حمیدہ کے بارے میں پوچھ کچھ نہ کریں، یا اگر کریں تو رشیدہ کے الفاظ میں طوفان نہ اٹھائیں۔"

صبح ہوتے ہی ناشتہ کیا اور مطب میں چلے گئے۔ دوپہر کو آئے کھانا کھایا اور قیلولہ کرنے لگے۔ سہ پہر کو قیلولہ سے فارغ ہو کر مطب چلے گئے۔ رات کو جب اطمینان سے واپس آئے اور کھانا سامنے لا کر رکھا گیا تو لقمہ توڑتے ہوئے کہا:

"لوبنا بہ نظر آتا ہے نہ حمیدہ سلام کو آئی، حالانکہ جب کبھی میں باہر سے آتا تھا۔ فوراً سو کام چھوڑ کر آتی تھی۔ کیا بات ہے۔؟ کچھ بیمار تو نہیں ہے۔؟"

حسینہ نے ٹھنڈی سانس لے کر غم انگیز لہجہ میں کہا:

بیمار ہوں اس کے دشمن، خدا کے فضل سے بالکل اچھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب: "تو کیا خفا ہے ہم سے، روٹھ گئی ہے کسی بات پر؟

حسینہ: میں کیا جانوں، بھائی بہن جانیں ——!

ڈاکٹر صاحب: بھئی لوبنا بہ جاؤ، ذرا حمیدہ کو بلا لاؤ۔

لوبنا بہ: لیکن وہ تو اب یہاں نہیں رہتیں۔ ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ کا لقمہ ہاتھ میں رہ گیا، وہ چونک سے پڑے۔ انہوں نے پوچھا۔ یہاں نہیں رہتی تو کہاں چلی گئی؟"

حسینہ: بس اب آئی گئی تیرے اوپر ہو گی۔ لوبنا بہ کے سر کی قسم کھاتی ہوں، نہ میں نے ہی حمیدہ کو کچھ کہا۔ نہ لڑائی ہوئی، نہ

کچھ، وہ خود ہی تنویر کو بلا کر اس سے مشورہ کرتی رہی اور دوسرے دن سامان لے کر چلی گئیں اپنے نئے گھر میں۔

ڈاکٹر صاحب: لیکن آخر کیوں؟

حسینہ: میں کیا جانوں؟

ڈاکٹر صاحب: یعنی اس نے یہ گھر مستقل طور پر چھوڑ دیا؟

حسینہ: "ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب: عجیب بات ہے، آخر کوئی وجہ تو ہوگی؟

رشیدہ: ہے تو۔

ڈاکٹر صاحب: وہی تو پوچھ رہا ہوں

رشیدہ: بس تنویر ــــــ اس کے بڑی وجہ اور کیا ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر صاحب: تنویر نے اسے اکسایا کہ بھائی کا گھر چھوڑ کر نیا گھر کرایہ پر لے اور وہاں بس جائے جاکر؟

رشیدہ: ہاں بھائی صاحب اور کیا!

ڈاکٹر صاحب: اور وہ اتنی بھولی تھی کہ تنویر کے کہنے میں آگئی۔؟

رشیدہ: ــ ہوا تو یہی!"

ڈاکٹر صاحب: دیدی کے ساتھ میں نہیں مان سکتا ان باتوں کو

حسینہ: وہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی آپ نہیں مانوگے۔

ڈاکٹر صاحب: تمہارا آخر کیا فکر ہے، کیوں بیچ میں بولے جاتی ہو؟"

رشیدہ: آپا نے تو رو رو کر روکا، منع کیا۔ سمجھایا، خوشامد کی



منت کی، لیکن حمیدہ نے ایک نہ سنی۔

ڈاکٹر صاحب: پھر بھی چلی گئی۔؟

رشیدہ: جی ہاں ــــــ آپا نے یہاں تک کہا کہ اپنے بھائی کو آجانے دو، پھر چلی جانا مگر ایک نہ سنی حمیدہ نے

ڈاکٹر صاحب: ــ حیرت ہے!"

رشیدہ: نوشابہ حمیدہ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی، چیخ چیخ کر رونے لگی، زبان پر صرف ایک ہی نعرہ تھا "میری اچھی پھپھی جان نہ جائیے۔" یہ کہتی جاتی تھی اور پھوٹ پھوٹ کر روتی جاتی تھی۔ خدا کی قسم اس کا رونا دیکھ کر میرے آنسو نکل آئے۔ لیکن حمیدہ کا پتھر دل نہ پسیجا"

ڈاکٹر صاحب: "شاید دماغ خراب ہوگیا ہے اس کا؟

رشیدہ: انھوں نے تو ہمیں بھی پاگل بنانے کا پورا سامان کر دیا تھا!"

ڈاکٹر صاحب: وہ کیا؟

رشیدہ: جب حمیدہ کا دل نوشابہ کی خوشامد اور رونے سے بھی نہ پسیجا اور وہ تشریف لے گئیں تو جانتے ہیں کیا ہوا۔؟

ڈاکٹر صاحب: کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں کیا جانوں، بتاؤ کیا ہوا؟

رشیدہ: نوشابہ بے ہوش ہوگئی۔ اس کے دانت بھنچ گئے، ٹھنڈا پسینہ آنے لگا، سارا بدن برف کی مانند ٹھنڈا پڑ گیا۔

ڈاکٹر صاحب: (کھانے کے برتن الگ کھسکاتے ہوئے) واقعی؟"

رشیدہ: جی ہاں بھائی صاحب! میرا اور آپا کا بُرا حال ہو گیا رو رو کے، قرآن مجید کی ہوا دی، نخلخہ سنگھایا، تب جا کر بڑی دیر میں ہوش آیا میرے لال کو ——— ہائے خدانخواستہ اسے کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی! آپا کا کیا حال ہوتا۔ آپ کو کون سنبھالتا؟

یہ کہہ کر رشیدہ ہچکیوں سسکیوں رونے لگی

حمیدہ نے کہا۔

"اگر رشیدہ نہ ہوتی تو نہ جانے میری بچی پر کیا گزر جاتی، وہ تو خیر یہ موجود تھی ——— جیسے ہی اسے ہوش آیا پچاس روپے اس نے خیرات کر دیے۔ محلے کے بچوں کو مٹھائی کھلائی، مجھے تو تن بدن کا ہوش نہ تھا ——— ایک یہ خالہ ہے، ایک وہ پھپھی جان ہیں، جائیے بس دیکھ لیا آپ کی حمیدہ کو، آپ تو جان چھڑکتے ہیں بہن پر اور بہن صاحبہ اکلوتی بھتیجی کی جان لیے لے رہی تھیں۔ اور دیکھیے بے چاری بڑی محبت کرتی ہیں نوشابہ سے"

———

# لگائی بجھائی

ڈاکٹر صاحب نے طنز سے بھری ہوئی یہ باتیں سنیں لیکن خاموش رہے۔ عمران سے کچھ نہ کھایا گیا۔ اس واقعے سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے کوئی اور وقت ہوتا تو حمیدہ اصرار کر کے کھلاتی اور دسترخوان سے بھوکا نہ اٹھنے دیتی، لیکن وہ ان کی عادات کی رمز شناس تھی، جانتی تھی اس وقت کچھ کہنا سننا بیکار ہے۔ جب ہو چکی، دسترخوان بڑھا دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب بھی خاموش تھے۔ رشیدہ اور حمیدہ بھی، نوشابہ آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا بات کریں اور کس بات سے گفتگو کا آغاز کریں! بڑی دیر اسی طرح گزر گئی۔

ڈاکٹر صاحب سگریٹ پیتے اور دو دو کش لے کر پھینک رہے تھے۔ ویسے وہ بہت کم سگریٹ پیتے تھے لیکن جب کسی فکر میں ہوتے

تو مسلسل پیتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے کہا :۔

"حمیدہ نے بڑی ناشائستہ حرکت کی۔ اس خودرائی کی مجھے اس سے توقع نہ تھی!"

حسینہ نے کہا: "اور اس سے بری حرکت یہ کی کہ نئے گھر میں مدرسہ کھول لیا ہے لڑکیوں کا۔ بھلا سوچئے تو کیا کہے گا ایسی ناک بھائی اتنا بڑا آدمی ہے لیکن بیوہ بہن کی کفالت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سوچتی ہوں تو جی چاہتا ہے زمین پھٹ جائے اور سما جاؤں۔"

ڈاکٹر صاحب نے تحیر سے حسینہ کی طرف دیکھا اور کہا:

"اچھا یہ بات ہے۔"

وہ بولی: "جی ہاں! سنا ہے کافی لڑکیوں کا جماؤ رہتا ہے ہر وقت اور وہ لاڈلے صاحبزادے شاہد میاں خوب چھیڑ چھیڑ کر لطف لیا کرتے ہیں ان لڑکیوں کو۔"

ڈاکٹر صاحب :۔ "شاہد تو ایسا نہیں تھا؟"

حسینہ :۔ لاڈ بڑی چیز ہے۔ یہی چیز تو اولاد کے لئے سم قاتل ہے۔ میری بھی خدا رکھے ایک لڑکی ہے اور دنیا جہان سے زیادہ اسے چاہتی ہوں، لیکن کھلاتی ہوں سونے کا نوالہ دیکھتی ہوں شیر کی نگاہ سے۔

رشیدہ : اور کیا ہونا بھی یہی چاہئیے!"

ڈاکٹر صاحب : "آج تو عجیب عجیب باتیں سننے میں آ رہی ہیں"

حسینہ : یہ تو ایسی باتیں ہیں۔ جب چاہئے۔ تصدیق کر لیجئے!

ڈاکٹر صاحب : نہیں تصدیق وصدیق کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

حسینہ : سچ کہتی ہوں، حمیدہ کے جانے کا بڑا دکھ ہے۔ ماشاءاللہ اتنا بڑا گھر ہے، خدا کے فضل سے اتنا کچھ کماتے ہو، حمیدہ کی دو روٹیاں ہم پر بھاری تو نہیں ہو سکتی تھیں۔ وہ رانی بن کر رہتیں۔ اس گھر میں راج کرتیں، ہمیں ہاتھ اٹھا کر دیتیں تو کھاتے۔ لیکن یہ منظور نہ ہوا۔ جا کے استانی بن گئیں، توبہ ہے!"

رشیدہ : یہ سب نور کی شرارت ہے۔ وہ تو بس کی پڑیا ہے!

حسینہ : کسی کی بھی شرارت ہو لیکن حمیدہ بچہ تو نہیں تھیں کہ نور کے بہکاوے میں آگئیں۔ انہوں نے سوچا ہوتا کیا کر رہی ہیں اور اس کا انجام کیا ہوگا!"

رشیدہ :۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انہیں ہم لوگوں سے نفرت ہے۔

حسینہ : ہاں میں بھی ایسا ہی محسوس کرتی ہوں۔"

رشیدہ : سوچو تو سہی کس چاؤ سے تم نے شاہد کو بیٹا بنایا تھا، کتنا چاہتی تھیں اسے، کتنا خیال رکھتی تھیں اس کا، روپیہ پیسہ کسی چیز سے باہر نہ تھی، اچھے سے اچھے کپڑے، جوتا، ٹوپی، ہر چیز موجود ہے!

حسینہ :۔ اے توبہ شاہد اور نور شاہد میں فرق کب کرتی تھی اور سچ پوچھو تو اب بھی محبت کرتی ہوں اس سے۔

رشیدہ : ہاں! —— لیکن اس نے جاتے وقت ہاتھ اٹھا کر سلام بھی نہ کیا۔ تم نے تو پکارا بھی، لیکن وہ پیچھے کے تمہاری طرف سے کترا رہا۔ دیکھیں جب اب میں تو آگے چل کر کیا ہوگا!"

حسینہ: ہو گا کیا؟ ——— بھی ہماری حیثیت ہی کیا ہے۔ مانو تو بت نہیں تو پتھر! تمہیں مانتے نہ مانیں، خوش رہیں، اچھے رہیں، بس اپنی تو یہ دعا ہے۔

رشیدہ: "اور کیا ہم کسی کا برا کیوں چاہیں، ہمارے آگے بھی اولاد ہے۔"

حسینہ: ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ رشیدہ کے جانے کا مجھے بڑا دکھ ہے: آج بھی ہے اور شاید زندگی بھر رہے گا لیکن خوشی بھی ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب: خوشی کس بات کی؟

حسینہ: یہ کہ شاہد چلا گیا۔ ہے تو ابھی لڑکا، لیکن ابھی سے شرارت ناچتی ہے اس کی آنکھوں میں۔ ایسے لڑکے کا، لڑکی والے گھر میں رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔"

رشیدہ: میں نے تو کئی دفعہ ٹوکا بھی اسے اور سمجھایا بھی تھا۔ لیکن تم تو اس کی محبت میں ایسی اندھی ہو رہی تھیں کہ ایک نہ سنی۔ الٹا مجھی کو ڈانٹ دیا۔"

حسینہ: میں کسی کے کہنے سننے میں نہیں آتی۔ اسی وقت کوئی رائے قائم کرتی ہوں جب خود کسی نتیجہ پر پہنچ لوں۔"

ڈاکٹر صاحب: یہ اچھی عادت ہے۔"

حسینہ: بہر حال جو کچھ ہوا برا ہوا، کاش اب بھی رشیدہ اپنی غلطی محسوس کریں۔"

رشیدہ: "یعنی واپس آ جائیں؟"

حسینہ: ہاں اور کیا ——— ان کا گھر ہے، آئیں، رہیں، کون منع کرتا ہے ——— ہاں یہ ضرور ہے کہ اب نوشابہ کا شاہد سے پردہ ہو گا۔"

ڈاکٹر صاحب: نہیں اتنی خودرائی سے کام لے کر تمہارے اصرار اور منع کرنے کے باوجود وہ چلی گئی تو اب بلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں سمجھ لوں گا، وہ مر گئی۔ اسے بھی سمجھ لینا چاہئے کہ میں مر گیا۔

حسینہ: خدا نہ کرے! پھر منہ سے ایسی بات نہ نکال دیا کرو۔

ڈاکٹر صاحب: بہت بیزار ہو گیا ہوں اس کی اس ناشائستہ حرکت سے۔ جی نہیں چاہتا کہ صورت بھی دیکھوں، تو اگر کبھی آ گئی، تو اس کی بھی خبر لوں گا!"

حسینہ: "کیا ضرورت ہے تو کسی کی خبر لینے کی؟ اپنا ہی سونا اگر کھوٹا ہو تو پرکھنے والے کا کیا دوش! حمیدہ اگر اچھی ہوتیں تو یہ کیا کر سکتی تھی ———"

———

# غم جانگداز

حمیدہ جانے کو تو نئے گھر میں چلی گئی لیکن نوشابہ کی یاد برابر دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ وہ چلتے وقت اس کا پاؤں سے لپٹ جانا، وہ رو رو کے اس سے نہ جانے کی التجا کرنا، وہ خود اس کے ساتھ چلنے کو اصرار کرنا، وہ حسینہ کی خونخوار آنکھیں، وہ رشیدہ کی قہر آلود نظر، یہ سارے منظر آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے اور ان میں سے ہر منظر اس کے دل ناتواں پر تیر و خنجر کا اثر کرتا ہے۔

کئی مرتبہ جی چاہا کہ واپس چلی جائے، نوشابہ کو کلیجہ سے لگائے، رو رو کے جی ہلکا کر دے اور اس سے کہے:

"میری بچی! میں آ گئی، میں اب کبھی نہ جاؤں گی۔ تیری محبت پر اپنی آن پر، اپنی خودداری، ہر چیز قربان کر دوں گی، اس گھر میں رہوں گی ذلتیں سہوں گی، بھابی اور رشیدہ کی دل کو چھلنی کر دینے والی باتیں



سنوں گی اور اُف نہ کروں گی۔ اب خوش ہو جا بہن، مسکرا کیا میرے لئے میرے ایثار کی بھی تو قدر نہ کرے گی؟"

اور جب وہ جانے کا ارادہ کرنے لگتی تو پھر اس کی آنکھوں کے سامنے حسینہ کا خونخوار چہرہ اور رشیدہ کی قہر آلود نظریں آجاتیں اور وہ سوچنے لگتی:

"میں تو ہر طرح گزر کر لوں گی لیکن ایسے جانے سے کیا فائدہ کہ جس کے لئے جاؤں اسی سے دور رہوں۔ بھابی ہرگز نوشابہ کو مجھ سے ملنے نہ دے گی۔ میرے جانے کے بعد نوشابہ کو قید رکھنا بھی ناممکن ممکن ہو جائے گا اور وہ ضرور مجھ سے ملنے کی، میرے پاس آنے کی، مجھ سے باتیں کرنے کی، کہانیاں سننے کی کوشش کرے گی۔ پھر اس پر اس جرم کی مار پڑے گی، اس کے بال پکڑ کر کھینچے جائیں گے، اس کے ننھے گالوں پر بے دردی سے طمانچے لگائے جائیں گے، اسے گالیاں سنائی جائیں گی ____ نہیں میرا وہاں جانا کسی طرح مناسب نہیں۔ یہ نوشابہ کے ساتھ دوستی نہیں دشمنی ہو گی! نہیں میں نہیں جاؤں گی!

گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی لیکن وہاں جانے کا نام نہیں لوں گی ... دیکھ کر میری بچی ہڑکے گی، پریشان ہو گی، اس کی دبی ہوئی محبت پھر ابھر آئے گی۔ میں اس کے معصوم اور ننھے سے دل پر اتنا بڑا ظلم نہیں ڈھا سکتی!"

حمیدہ نے کلیجہ مسوس لیا، دلاور منزل جانے کا خیال

سے اٹھنے جا رہی تھی۔ لیکن دلاور منزل آنے کے بعد
اسے احساس ہوا کہ کتنا چاہتی ہے! کھانا پکا رہی ہو تو شاہد سے
باتیں کر رہی ہو۔ تنویر سے دنیا جہان کے مسائل پر گفتگو ہو رہی ہو، نماز
پڑھ رہی ہو، کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی ہو، کچھ کر رہی ہو، یہ ناممکن
تھا کہ نوشابہ کی پیاری تصویر سامنے آکر نہ کھڑی ہو جائے۔ اس کے بعد
کچھ نہ کر سکتی۔ اس کی آنکھوں کے چشمے سے آنسو ڈھلکنے لگتے۔ بیتاب
ہو جاتی لاکھ لاکھ ضبط کرتی مگر بے بس ہو جاتی۔ شاہد پریشان ہو جاتا تو
خود بھی ساتھ ساتھ رونے لگتا۔ لاکھ لاکھ پوچھتا۔

"کیا بات ہے کیوں رو رہی ہو؟"

لیکن ان کی آنکھوں سے آنسو برستے رہتے۔ وہ روتی رہتی۔

تنویر نے اس کی پریشانی اور غم کا یہ حال دیکھا تو بے قرار ہو گئی
اس نے سوچا اگر یہی کیفیت رہی تو اس غم میں گھل گھل کر مر جائے
گی۔ اسی لئے اس نے لڑکیوں کا اسکول کھول دیا تھا۔ اس طرح
دن بھر کا اچھا مشغلہ حمیدہ کے ہاتھ آگیا۔ دن کا بڑا حصہ اس مشغلہ
میں گزر جاتا۔ اسی اثنا میں نوشابہ بھی یاد آتی رہتی۔ اس کی تصویر سامنے
آکھڑی ہو جایا کرتی، لیکن مشغولیت اور مصروفیت میں توجہ کرنے کا
زیادہ وقت نہ ملتا۔"

لیکن شام شب بیداری بن کر آتی، شاہد کو کھلا پلا کر پڑھا لکھا کر
جب سلا دیتی اور خود سونے کے لئے لیٹتی تو پھر نوشابہ آ موجود ہوتی
پھر دونوں میں نہ ختم ہونے والی باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا کبھی



گزر جاتی۔ فجر کی اذان ہوتی تو گھبرا کر اٹھ بیٹھتی اور پھر سے روزانہ کے
کاموں میں لگ جاتی۔ شاہد کے لئے ناشتہ کا انتظام، اسے اسکول
روانہ کرنے کی تیاری، پھر اپنے مدرسہ کی لڑکیوں کا ہجوم، انھیں پڑھانا
لکھانا سکھانا۔ ادب کرنا سینا پرونا سکھاتا، سارا دن انہی مصروفیتوں
میں صرف ہو جاتا تھا، پھر حسب معمول رات آتی۔ اور پھر حسب معمول وہ اپنی
نوشابہ کے پاس پہنچ جاتی ———— اپنی عالم خیال
کی لذتیں ———!

ایک سال اسی طرح گذر گیا، لیکن حمیدہ کے اطوار میں کوئی فرق نہ
آیا۔ غم سے کچھ ایسی وابستگی ہو گئی تھی کہ دونوں میں سے کوئی بھی ساتھ چھوڑنے
پر تیار نہ تھا، وہ اندر ہی اندر گھلتی جا رہی تھی لیکن خاموش تھی۔ کیا مجال
حرف شکایت یا حرف مطلب زبان پر آجائے۔ جان چلی جائے یہ
طور تھا، لیکن کسی کا اظہار ہو یہ ناممکن۔

تنویر حمیدہ کی حالت دیکھ رہی تھی، لیکن وہ بھی مجبور تھی، کیا کر سکتی
تھی وہ معاملہ ایسا تھا کہ اس میں کسی طرح دخل نہیں دیا جا سکتا تھا
حمیدہ کو بہلانے کی بے چاری نے بہت کوششیں کیں، لیکن
کوئی تدبیر بھی کامیاب نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کا سفر سے واپس آنے
کے بعد کچھ وقت بھی حمیدہ کو نہ پوچھنا اور بھی غضب ہو گیا تھا۔
حمیدہ اور تنویر دونوں اپنی اپنی طور پر بجا طور پر [illegible] اور
رشیدہ کا جادو چل گیا۔ وہ خفا ہیں۔ حمیدہ نے جس طرح نوشابہ کی
جدائی پر صبر کیا تھا اسی طرح بھائی کی مفارقت پر بھی خاموش رہی
یہ دوسری بات تھی کہ دل میں آگ بھڑک رہی تھی، کلیجہ پھنکا رہا تھا

ایک روز تنویر نے کہا :-

"معلوم ہوتا ہے تو شاہد کے غم میں جان دے دو گی امی!"

وہ اداس لہجہ میں بولی :-

"شاہد کے سبب جان دینا تو نہیں چاہتی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ غم خود ہی میری جان لے کر رہے گا، خیر! مرضی مولیٰ، از ہمہ اولیٰ!"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں، پھر وہ رونے لگی۔ تنویر نے ایک تجویز پیش کی :-

"ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ حسینہ اور نوشابہ کو اپنے ہاں دعوت دو، اس میں تو کوئی حرج نہیں، تھوڑی دیر کے لئے سہی، لیکن نوشابہ کو دیکھ تو لو گی، کلیجہ میں ٹھنڈک تو پڑ جائے گی۔"

حمیدہ نے اس تجویز کو پسند کیا، لیکن کہا : "شوق سے بلا تو لوں لیکن وہ آنے کیوں لگیں، اور اگر کسی طرح آئیں بھی تو دیکھ لینا نوشابہ کو ساتھ نہیں لائیں گی، ایسا ہوا تو میرا کلیجہ پھٹ جائے گا اور خون تھوکنے لگوں گی!"

تنویر نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ اس تدبیر پر عمل کر کے تو دیکھو، اگر حسینہ نے آنے سے انکار کیا یا نوشابہ کو نہ لائی تو پھر ہم کوئی دوسرا بندوبست کریں گے۔"

حمیدہ نے شاہد کو بلایا اور کہا۔

"بیٹے! ذرا دلاور منزل چلے جاؤ، بھائی صاحب سے کہنا [illegible]

کی دعوت کی ہے!"

"شاباش جاؤ میرے بچے! ابھی چلا جا!"

شاہد یہ پیام سن کر بہت خوش ہوا اور خوشی کا جھولا جھولتا دلاور منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

# پیامبر

شاہد کے جانے کے بعد تنویر نے حمیدہ کو چھیڑتے ہوئے کہا۔
"بڑی غضب کی محبت ہے تمہیں نوشابہ سے!"

حمیدہ نے جواب دیا:
"ہاں بہت زیادہ، مجھے خود اس بے پناہ محبت کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ تو یہاں آکر محسوس ہوا کہ جیسے اس کے بغیر زندگی کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ میں نے اپنے شوہر کا غم جھیل لیا۔ حالانکہ ان سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ جانتی ہو۔ کیسے جھیلا؟"

تنویر:- نہیں جانتی!

حمیدہ: نوشابہ کی وجہ سے ــــــــ وہ میری زندگی بن گئی۔ دل میں امنگ پیدا ہوئی کہ اس کے لئے جینا چاہیے۔"

تنویر:- اچھا ہی ہوا، ورنہ نصیب دشمناں تمہارا فاتحہ بھی پڑھ چکے ہوتے ہم لوگ۔

حمیدہ: "اور کیا ــــــــ اور لطف یہ ہے کہ میں نے نوشابہ کو نہیں چاہا۔

تنویر:- پھر؟ وہ عشق کرنے لگی آپ سے؟

حمیدہ: ہاں اور کیا، اس نے زبردستی مجھ سے محبت کرلی، وہ اس قدر زیادہ مجھ سے قریب آگئی اور اس طرح چپکے سے میرے دل میں قدم جاکر بیٹھ گئی کہ میں اسے نکال نہ سکی میں اس سے محبت کرنے پر مجبور ہوگئی۔"

تنویر: خدا مبارک کرے، یہ جوڑی سلامت رکھے!

حمیدہ: تم تو مذاق کر رہی ہو تنویر!

تنویر:- اور کیا کروں؟

حمیدہ:- اچھا تو ہنس لو، مذاق اڑا لو ــــــــ لیکن تنویر اگر بھائی نہیں آئیں یا آئیں اور نوشابہ کو اپنے ساتھ نہ لائیں تو کیا ہوگا!"

تنویر: کچھ نہیں ہوگا، سورج اسی طرح چمکتا رہے گا، دنیا کی رونق اسی طرح قائم رہے گی، لوگ اسی طرح اپنے دھندوں میں لگے رہیں گے۔"

حمیدہ: وہ تو ٹھیک ہے لیکن میرا کیا حشر ہوگا؟"

تنویر:- پاگل ہو جاؤگی۔

حمیدہ:- ہاں یقیناً، قطعاً۔"

تنویر: بس تو پھر پاگل خانہ کی آبادی میں ایک شریف خاتون کا اضافہ ہو جائے گا۔

حمیدہ: پھر وہی ——— آگئیں اپنی اوقات پر

تنویر: ہاں ——— لیکن تم بھی اپنی اوقات پر رہو —

یہ کہہ کر تنویر ہنس پڑی، حمیدہ کے ہونٹ بھی بہت دنوں کے بعد تبسم سے آشنا ہوئے —

حمیدہ نے پوچھا: —

"شاہد واپس نہیں آیا اب تک؟"

تنویر نے جواب دیا:

آ جائے گا!

حمیدہ: لیکن اتنی دیر تو ہو گئی!

تنویر: کتنی دیر ہوئی؟ مشکل سے پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے

حمیدہ: لیکن وہ تو سائیکل پر گیا ہے، اب تک آ جانا چاہیئے تھا اُسے۔

تنویر: ہوائی جہاز پر جاتا تو بھی اتنی جلد نہیں آسکتا تھا۔

حمیدہ: واہ یہ کیوں؟

تنویر: اتنے دنوں کے بعد گیا ہے کچھ باتیں ہوں گی، پوچھ گچھ ہوگی، حسینہ بیگم کے طعنے ہوں گے رشیدہ بیگم اگر اتفاق سے رُجحان ہوئیں تو کچھ جلی کٹی باتیں ہوں گی، دیر لگنی ہی چاہیے مگر بہرحال پیام لے کر گیا ہے تو جواب لے کر آئے گا۔

---

# شوقِ حرماں

شاہد ہنستا کھیلتا، مسکراتا دلاور منزل پہنچا۔ اتفاق سے اس وقت ڈاکٹر صاحب اندر موجود تھے۔ تو شاہدہ انھیں انگریزی کی پوئٹری سنا رہی تھی۔ حسینہ بیگم پاس بیٹھی چھالیا کتر رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب آرام کرسی پر دراز، پوئٹری سنے جاتے اور آنکھیں بند کیے کچھ سوچتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی سگریٹ کا ایک آدھ کش بھی لگا لیتے جو آہستہ آہستہ انگلیوں کے شکنجے میں سلگ رہا تھا۔

حسینہ نے چھالیا کترتے کترتے کہا۔

"کیا سو گئے ——— واہ اچھی نیند ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے آنکھیں بند کیے کیے جواب دیا: —

"نہیں بیگم سویا نہیں کچھ سوچ رہا ہوں!"

حسینہ بیگم بولیں

دیکھو رشیدہ چلی گئی نا آخر، کتنا روکا میں نے مگر نہ رکی۔

ڈاکٹر صاحب: نوشابہ روکتی تو ضرور رک جاتی!

حسینہ: نوشابہ نے بھی روکا تھا۔

ڈاکٹر صاحب: پھر بھی چلی گئی؟

حسینہ: ہاں! ——— بد قسمت کہیں کی۔

ڈاکٹر صاحب: پھر اس میں اور حمیدہ میں فرق کیا ہوا؟

حسینہ: ضرورت سے گئی ہے، وعدہ کر گئی ہے، چند دن میں آ جائے گی۔ آخر اپنا گھر بھی تو سنبھالنا ہے غریب کو!

ڈاکٹر صاحب: دنیا کا اصول ہی یہ ہے کہ پہلے تو ڈھیر کھلی اور ——

حسینہ: کچھ دماغ چل گیا ہے آج۔ کیسی باتیں کرنے لگے تم؟ یہ رشیدہ کو کہہ رہے ہو جو ہزار جان سے قربان ہے نوشابہ پر، مجھ پر، تم پر۔

ڈاکٹر صاحب: ہاں! لیکن جب امتحان لیا گیا تو بری طرح فیل ہو گئی۔

حسینہ: اچھا مذاق چھوڑو، ذرا غور سے سنو، میں ایک بات کہہ رہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب: تو کہتی کیوں نہیں؟ کہو۔

حسینہ: رشیدہ کے شوہر انوار میاں مکان بیچ رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب: معلوم ہے، اچھا خاصا نیا ہے۔ دس ہزار میں بنوایا تھا، بیس ہزار مل رہے ہیں تو رال ٹپک پڑی، کہتا ہے اسے بیچ کر دوسرا بنواؤں گا۔"

حسینہ: تو جب تک نیا مکان بنے رشیدہ یہیں کیوں نہ آ ٹھہرے؟

ت۔ اللہ اتنا بڑا گھر بھائیں بھائیں کرتا رہتا ہے۔ ذرا آبادی رہے گی
ق رہے گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نوشابہ کی طبیعت بہلی رہے گی!

اکٹر صاحب: مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، بلا لو ——
لیکن کچھ روز بعد جب نوشابہ خوب اچھی طرح ان سے مل گئی
ںہوں نے بھی داغ جدائی حمیدہ کی طرح دیا تو؟ ——
پھر کیا ہوگا؟

حسینہ: واہ اچھی مثال حمیدہ کی مل گئی ——— اب دنیا میں جو ہے، وہ حمیدہ ہی ہے!"

ڈاکٹر صاحب: دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کے پیتا ہے۔ میں تو اب سب کے بارے میں یہی سمجھنے لگا ہوں۔

حسینہ: سب کی بات اور ہے، رشیدہ کی بات اور ہے۔

ڈاکٹر صاحب: ہو گی، دیکھیں گے!

انہی باتوں کے دوران میں شاہد پہنچ گیا۔ اس نے ادب سے
اکٹر صاحب اور حسینہ کو سلام کیا۔ ڈاکٹر صاحب اب تک آنکھیں
بند کئے پڑے تھے اور بیوی کی باتوں کا جواب دیتے جا رہے تھے
ہوں نے نہ اسے سلام کرتے دیکھا، نہ جواب دیا۔ حسینہ بیگم نے
سلام کا جواب میں کہا:-

"جیتے رہو بیٹے! ہمارے بڑے نصیب کہ تم نے ادھر جھانکا
ز ——— ارے نوشابہ! تو یہاں بیٹھی کیا کر رہی
ہے جا اپنے کمرہ میں!"

نوشابہ چپ چاپ اٹھی اور اپنے کمرہ میں چلی گئی

ڈاکٹر صاحب نے آنکھیں کھولیں، تو شاہد سامنے کھڑا تھا اسے دیکھ کر تیوری چڑھ گئی، چہرے پر بھی بیزاری بلکہ نفرت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اب تک لیٹے ہوئے تھے۔ اب ٹیک لگا کر سیدھے (بیٹھے) سگریٹ جلایا اور مسلسل کئی کش لگا کر اسے گھورا، اور پھر کہا:۔

"کیسے آنا ہوا شاہد؟"

شاہد نے ادب کے ساتھ جواب دیا:۔

"آپ نے بھیجا ہے، اس لئے حاضر ہو گیا!"

ڈاکٹر صاحب:۔ "ہوں! ——— اسی لئے یہاں تک آنے کی زحمت کیوں گوارا فرمائی؟"

یہ لب و لہجہ شاہد کے لئے بالکل نیا تھا۔

وہ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ اتنے دنوں کے بعد جا رہا ہے۔ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا، ماموں شفقت سے سر پر ہاتھ پھیریں گے، پاس بٹھائیں گے، باتیں کریں گے، ممانی بھی اب خفا نہ ہوں گی۔ اچھی طرح پیش آئیں گی۔ نوشابہ سے بھی کچھ باتیں ہوں گی۔ ایک انگوٹھی بہت دنوں سے اس کی جیب میں پڑی تھی۔ اگر موقع ملا تو ممانی کی آنکھ بچا کر یہ تحفہ نظر کر دوں گا۔ ذرا لطف رہے گا۔

لیکن یہ کچھ نہ ہوا، وہ ہوا جس کی ذرا بھی توقع نہیں تھی۔ ماموں (ڈاکٹر صاحب)، کی کج ادائی کی بے رخی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نوشابہ کی سختی اور درشتی کے ساتھ دوسرے کمرے میں جانے کی ہدایت ان سب باتوں نے دل میں کچھ عجیب سا اثر کیا۔ وہ گھبرا گیا! اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔"



ڈاکٹر صاحب نے اسی لب و لہجہ میں دریافت کیا:۔

"کیوں بھیجا ہے حمیدہ نے تمہیں؟"

شاہد:۔ "انھوں نے دعوت کی ہے آپ کی، ممانی کی اور نوشابہ کی!"

ڈاکٹر صاحب:۔ "دعوت کی ہے؟ ———"

شاہد:۔ "جی! ———"

ڈاکٹر صاحب:۔ "تمہیں پیامبر بنا کر بھیجا ہے؟"

شاہد:۔ "جی! ———"

ڈاکٹر صاحب:۔ "وہ خود نہیں آ سکتی تھی؟"

یہ ایسا ٹیڑھا سوال تھا جس کا جواب شاہد کے پاس نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب:۔ "کہہ دینا، دعوت نہیں قبول کی جا سکتی جس نے ہمیں چھوڑ دیا، ہم اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے"،

جس نے ہمیں چھوڑ دیا، ہم اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے جس نے اپنی بھابی کے ساتھ بدتمیزی کی، اسے کوئی حق نہیں کہ بھابی کی دعوت کرے جس نے نوشابہ کے آنسوؤں پر رحم نہ کھایا، اس کے گھر نوشابہ کسی طرح بھی نہیں جا سکتی ہے"

بیگم:۔ "خواہ تم چلے بھی جاتے، مگر میں نہ جاتی ——— اور نوشابہ تو قیامت تک نہ جاتی"

ڈاکٹر صاحب:۔ "ہاں ٹھیک ہے، کوئی بھی نہیں جا سکتا

اب شاہد کے لئے کوئی موقعہ نہ تھا کہ ٹھہرتا جس خوشی سے آیا تھا۔ اسی افسردگی کے ساتھ واپس ہوا۔

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

آتے وقت ہوا پر اڑتا آیا تھا، جاتے وقت پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ جب گھر میں قدم رکھا تھا تو باچھیں کھلی جا رہی تھیں جب گھر سے باہر قدم نکالا تو نہ جانے کیوں آنسو ایک طوفان کی شکل میں امڈے چلے آ رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا پھوٹ پھوٹ کر رو دے لیکن حمیدہ کا رشتہ بھی آن اور خودداری کا مالک تھا۔ آنسو کا ایک قطرہ بھی آنکھ سے نہیں گرنے پایا۔"

---



# سن لیا سب کچھ

نور اور حمیدہ میں دلاور منزل کی باتیں ہو رہی تھیں، کچھ بھائی کا تذکرہ، کچھ حسینہ کا ذکر، کچھ رشیدہ کی خاموش شرارت اور فتنہ انگیزی کا حال اور ______ لونشا کی یاد؟"

وقت تھا کہ طول شب فراق کی طرح ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا حمیدہ کا اضطراب تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ حمیدہ بظاہر نور سے باتوں میں مشغول تھی، لیکن دل ہی دل میں بے تابی سے شاہد کا انتظار کر رہی تھی۔ بار بار نظر دروازوں پہ جاتی تھی اور مایوس واپس آ جاتی تھی۔"

آخر خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں، شاہد آ گیا۔ لیکن کس طرح! چہرہ اترا ہوا، آنکھیں پرنم۔ پریشان، دلگیر، افسردہ، دل ریش۔"

[illegible]

"بیٹے کیا بات ہے؟ تو اتنا اداس کیوں نظر آ رہا ہے؟"
اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا
"دھوپ بڑی سخت ہے!"

تنویر:- "والد منزل ہو آئے؟"

شاہد: "ہو آیا ——— وہیں سے تو آ رہا ہوں۔"

تنویر:- "بھائی صاحب سے ملاقات ہوئی؟"

شاہد: "ہاں! گھر میں تھے!"

تنویر: "اور وہ ملی جانو آسیہ بیگم بھی وہیں پاس بیٹھی چھالیہ کتر رہی ہوں گی!"

شاہد:- "جی ہاں!"

تنویر:- "نوشابہ بھی تھی۔"

شاہد:- "وہ بھی ماموں صاحب کے قریب ہی بیٹھی تھی"

تنویر:- "پھر ہوا کیا؟ یہ تو بتاؤ ——— دعوت دے آئے تم؟"

شاہد: "اور گیا کس لئے تھا؟"

تنویر:- "پھر کیا جواب ملا؟"

شاہد: "مجھے تعجب ہے کہ خلاف توقع سا نہ ملنے گیا؟"

تنویر: "اے دانے! تم گئے شاعری کر رہے ہو یا باتیں؟ بتاؤ کیا کہا انہوں نے؟"

شاہد: "ماموں جان نے دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔"

[illegible]



نوشابہ کو تو اپنے ساتھ ہرگز نہ لے جاتی۔ نوشابہ ماموں جان کے پاس بیٹھی تھی اگر تک کر کہا یہاں کیوں بیٹھی ہے، جا اپنے کمرے میں وہ بھی ہٹلی جب چاپ چلی گئی۔"

تنویر: "اچھا تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے، یہاں تک، اس قدر جلد پہنچ جائے گا اس کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔"

شاہد: "دیکھ لیجئے!"

تنویر: "آخر بھائی صاحب نے کیا کہا؟ ان کے الفاظ کیا تھے؟"

شاہد: "انہوں نے کہا ہم دعوت نہیں قبول کر سکتے۔"

تنویر: "حیرت ہے!" "یہ کہا؟"

شاہد:- "ہاں! اور کہا جس نے ہمیں چھوڑ دیا ہم اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے جس نے اپنی بھائی کے ساتھ بدتمیزی کی اسے کوئی حق نہیں کہ بھائی کی دعوت کرے جس نے نوشابہ کے آنسو پر رحم نہ کھایا اس کے گھر نوشابہ نہیں جا سکتی کسی طرح بھی"

تنویر:- "یہ میں کیا سن رہی ہوں؟"

شاہد:- "جو ماموں اور ممانی نے کہا۔"

تنویر:- "دیکھ لیا تم نے حمیدہ! اپنی بھائی جان کا کارنامہ؟"

حمیدہ اب تک خاموش بیٹھی ہوئی تنویر شاہد کی باتیں سن رہی تھی چہرے کے آثار چڑھاؤ سے اندرونی کیفیت کا جو کچھ غم و التہاب تھی صاف اندازہ ہو رہا ہے تنویر کے اس سوال پر چونکی اس نے کہا
"ہاں تنویر! دیکھ لیا ——— میں پہلے ہی کہتی تھی، بھائی

[illegible]

تنویر: ہاں بھئی تمہارے ولی اللہ ہونے پر ہم ایمان لے آئے لیکن آج
اعلان کرتی ہوں کہ حسینہ کی صورت زندگی بھر نہیں دیکھوں گی۔
رشیدہ سے قیامت تک بات نہیں کروں گی۔ ان دونوں نے..
ہمارے بھائی کو ہم سے چھڑوایا ہے یہ ایسا جرم نہیں ہے جسے
معاف کیا جا سکے۔"

حمیدہ:- یہ تو اس طرح کہہ رہی ہو۔ جیسے رشیدہ اور بھائی تم سے
معافی مانگنے آئی ہیں اور دست بستہ کھڑی ہیں اور تم اپنے
عہد کا اعلان کر رہی ہو ——— پگلی، تو اب چھوڑے
گی، وہ تو بہت پہلے چھوڑ چکی ہیں۔"

تنویر:- یہاں کون مرا جا رہا ہے ان کے لیے ———
کیوں شاہد! بھائی جان تم سے کس طرح پیش آئے؟"

حمیدہ:- جس طرح پیش آتے تھے اسی طرح پیش آئے ہوں گے
خطا ہی کیا ہے شاہد بے چارے نے کیا بگاڑا ہے
کسی کا ——— کیوں شاہد؟"

شاہد: لیکن اس مرتبہ عجیب بات یہ دیکھی کہ ماموں جان
مجھ سے بہت کھنچے کھنچے سے تھے۔"

حمیدہ:- چل ہٹ ——— بولنے کے جانا۔"؟

شاہد:- غور تو کیجئے، الو شاہد کو اس بری طرح سے گھر ک کھڑے
میرے سامنے سے کیوں بھگایا گیا۔؟

حمیدہ:- یہ تو بھائی نے کہا ہے ان سے امید بھی تھی، بھائی
صاحب نے کوئی برا برتاؤ کیا ہو تو بتاؤ؟"



شاہد: پہلے جب کبھی ان کے سامنے گیا، محبت سے اپنے پاس
بٹھا لیتے، سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے، اچھی اچھی باتیں
کرتے تھے۔

تنویر: "بیٹھے ہوئے" اور اس مرتبہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، چھوٹتے ہی طمانچہ
جڑ دیا منہ پر؟"

شاہد:- طمانچہ تو نہیں جڑا، لیکن برتاؤ اس سے بھی سخت تھا۔ اتنی
دیر کھڑا رہا، دھوپ بالکل میرے چہرے پر پڑ رہی تھی، کرسی
خالی پڑی تھی۔ مگر یہ تک نہیں کہا کہ بیٹھ جاؤ، میں کھڑا رہا،
وہ تقریر کرتے رہے، پھر کہہ دیا، جاؤ ابھی کہہ دو جا کر اپنی
ماموں کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔"!

یہ کہتے کہتے شاہد کی آنکھیں آبگوں ہو گئیں۔

تنویر: تعجب ہے، یہ تم کہہ رہی ہو۔

حمیدہ: ہاں تنویر! شاہد وہاں نہ جاتا تو امید کا دامن میرے ہاتھ سے نہ چھٹتا۔ نوشابہ سے زندگی بھر ملاقات نہ ہوتی۔ یہ دوسری بات ہے۔ لیکن آس تو تھی، آج وہ آس بھی ٹوٹ گئی اور وہ امید بھی جاتی رہی۔ اب زندگی کس طرح گزرے گی؟ اب میں کس طرح زندہ رہوں گی؟

تنویر: نہیں حمیدہ! ایسا نہ کہو ایسی باتیں نہ کرو۔ خدا بڑی چیز ہے۔ تم دو چار دن سے دیکھ رہی ہو ناں ہے۔ اسی طرح پریشان ہو کر اپنی جان کی دشمن نہ ہو۔ یقین کرو یہ بادل چھٹ جائیں گے۔ یہ دور ختم ہو جائے گا۔ نوشابہ تمہاری ہے، تمہاری رہے گی۔ گوشت سے ناخن جدا نہیں ہوتا۔ لاکھ حسینہ اور رشیدہ اپنی سی کریں آخر کو منہ کی کھائیں گی۔

حمیدہ: یہ طفل تسلیاں ہیں۔ میں ان باتوں میں نہیں آ سکتی (ہاتھ بڑھا کر) دیکھو شاہد! مجھے بخار چڑھ آیا ہے۔ سارا بدن کانپ رہا ہے۔

شاہد بیٹے! کوئی چیز لا کر اوڑھا دے!

یہ کہتے کہتے وہ چارپائی پر دراز ہو گئی۔ تنویر نے نبض دیکھی تو واقعی جیسا جوت بخار چڑھا تھا۔ وہ گھبرا گئی۔ گھر کے پاس ہی ایک حکیم صاحب رہتے تھے۔ انہیں بلایا۔ ان کے آتے آتے حمیدہ بے ہوش ہو چکی تھی۔



# یاس!

شاہد کی اس گفتگو نے حمیدہ کو بالکل مایوس کر دیا۔ اب تک ذرا سی جو آس تھی نوشابہ کو کبھی کبھی دیکھ لینے کی، اسے اپنے ہاں بلا لینے کی اب وہ جاتی رہی ——— بھائی کے چھٹنے کا اتنا غم نہ تھا جتنا نوشابہ سے بچھڑنے کا۔ اس نے بڑی بے چارگی کے ساتھ تنویر سے کہا:

”بتاؤ اب کیا ہوگا؟“

تنویر نے کہا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

حمیدہ: میں نے بڑی غلطی کی، شاہد کو نہیں بھیجنا چاہئے تھا!

تنویر: کیوں؟ ——— اس طرح تو بات صاف ہو گئی

[illegible]

# درد لادوا

انسان کی زندگی بھی، قدرت کا عجوبہ ہے مضبوط اتنی کہ توڑے نہیں ٹوٹے۔ تلوار، بندوق، چاقو، خنجر ہر چیز کے وار سہہ لے اور بچ جائے اور کمزور ایسی کہ آبگینہ کی طرح ذرا سی ٹھیس لگی اور چکنا چور ہوا۔

حمیدہ نے قاسم کا حادثۂ مرگ برداشت کر لیا، لیکن نوشابہ کی جدائی برداشت نہ کر سکی۔

شاہد کی باتیں سن کر جو اس کی بیماری کی صورت میں غم جانگداز کا حملہ ہوا، پھر وہ بستر سے نہ اٹھ سکی تنویر نے بیٹا ہونے اور دوستی کا حق ادا کر دیا۔ دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا۔ شاہد صبح سے شام تک ماں کی پٹی سے لگا بیٹھا رہتا، احسن میاں اسکول سے واپس آتے تو سارا دن حمیدہ ہی کے ہاں صرف کر دیتے۔ کئی ڈاکٹر اور حکیم ان کے دوست تھے۔ ایک ایک کر کے سب کو بلایا، سب کو دکھایا سب کا علاج کیا لیکن ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

تنویر نے کئی مرتبہ چاہا کہ ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دے دے، یا جا کر انہیں بلا لائے، لیکن حمیدہ کی سخت تاکید تھی کہ سب کچھ کرنا مگر بھائی صاحب کو میری بیماری کی اطلاع نہ کرنا۔ انہیں میرے علاج پر آمادہ نہ کرنا۔ وہ مجھے چھوڑ چکے ہیں۔ وہ میری صورت دیکھنے کو تیار نہیں۔ انہوں نے نوشابہ کو مجھ سے چھڑا دیا ہے۔ میں خود بھی ان کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔ ہم دونوں اس پر متفق ہیں۔ کہ اس دنیا میں ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ تنویر، حمیدہ کے مزاج اور عادات سے واقف تھی۔ اس لئے یہ باتیں سن کر ارادہ بدل دیا!

وہ مدرسہ جو بڑی مشکلوں سے اور بڑی دیر میں کامیابی کے ساتھ چلنا شروع ہوا تھا، حمیدہ کی بیماری نے اسے ویران کر دیا۔ وہ گھر جسے آئینہ کی طرح اس نے صاف شفاف بنا رکھا تھا۔ اب کوڑے کرکٹ کا مرکز معلوم ہوتا تھا۔ وہ کمرہ جس کی صفائی کا یہ عالم تھا کہ سوئی پھینکو تو ڈھونڈ لو، اب یہ حال ہو گیا تھا کہ بس دواؤں کی شیشیوں کا کباڑ خانہ بن گیا تھا۔ تنویر کی بہترین کوششوں، احسن میاں کی بہترین تدبیروں، ڈاکٹر صاحب اور حکیموں کے بہترین علاج معالجہ کے باوجود حالت روز بروز ابتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ شروع میں تو ڈاکٹر حکیم سب امید دلاتے رہے۔ کہ کوئی بات نہیں ہے۔ چند روز میں لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جائیں گی۔ لیکن اب مایوسی کا اظہار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ہوں یا حکیم صاحب، سب

Rekhta

جی چھوڑ چکے تھے۔ ڈاکٹر غنی سے جو اس گھر کے مستقل معالج تھے۔ تنویر نے ایک دن پوچھا۔

"کہئے ڈاکٹر صاحب! حمیدہ کا کیا حال ہے؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولے:۔

"کیا بتاؤں جو کچھ ہے وہ آپ دیکھ رہی ہیں"

تنویر نے سہم کر پوچھا:

"کیا اچھی ہوجائے گی؟"

ڈاکٹر صاحب نے ایک ڈاکٹر سے زیادہ خدا رسیدہ شخص کے انداز میں کہا:

"اللہ سب کچھ کرسکتا ہے"

تنویر نے جرح کی:

"وہ تو سب کچھ کرسکتا ہے لیکن قرینہ کیا ہے، امید کیا ہے"

ڈاکٹر صاحب کو اب صاف گوئی سے کام لینا پڑا۔ فرمایا۔

"بظاہر تو کوئی امید نہیں اور یوں جب تک سانس، تب تک آس۔"

یہ سنکر تنویر رونے لگی۔ ڈاکٹر غنی نے دلاسا دیا۔

"اس سے کیا ہوگا اگر رونے سے موت ٹل سکتی تو میں بھی آپ کے ساتھ بیٹھ کر روتا!"

تنویر نے آنسو پونچھ لئے اور بڑی بے بسی کے ساتھ پوچھا:۔

"پھر کیا کروں؟"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:۔

"دعا کیجئے، خیرات کیجئے، قربانی کیجئے، اب انسانی قوت کچھ نہیں کرسکتی، خدا سب کچھ کرسکتا ہے۔ میرا تجربہ تو کہتا ہے کہ آج کی رات ملنا مشکل ہے۔۔۔"

تنویر پھر رونے لگی:۔

"ایسا نہ کہئے ڈاکٹر صاحب"۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:۔

"یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اگر کچھ وصیت وغیرہ کرانا ہو تو کرا لیجئے"

وہ بولی:۔

"وصیت ۔۔۔۔ اس غریب کے پاس رکھا کیا ہے جو وصیت کرے گی؟ اس کی پونجی، اس کی دولت، اس کا سرمایہ جو کچھ ہے، شاہد ہے۔"

ڈاکٹر غنی:۔ شاہد اچھا لڑکا ہے۔

تنویر: بہت اچھا، بڑا سعادت مند، خدا اس کی عمر دراز کرے!

ڈاکٹر غنی:۔ میں دیکھتا ہوں، ماں کی بیماری سے پریشان بھی بہت ہے تیمارداری میں ہر وقت لگا رہتا ہے؟

تنویر: ہاں ڈاکٹر صاحب بہت چاہتا ہے اپنی ماں کو، میں نے کئی مرتبہ چھپ چھپ کے اسے روتے ہوئے دیکھا ہے۔

ڈاکٹر غنی:۔ کہیں ایسا تو نہیں، شاہد کی وجہ سے کوئی صدمہ پہنچا ہو حمیدہ کو؟

تنویر:۔ توبہ کیجئے! شاہد سے غیروں اور دشمنوں کو بھی صدمہ نہیں

پہنچ سکتا، ہاں کو کیا پہنچے گا؟"

ڈاکٹر غنی: ٹھیک ہے ٹھیک ہے!"

تنویر: لیکن ڈاکٹر صاحب، یہ سوال آپ نے کیوں کیا تھا؟"

ڈاکٹر غنی: کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے کوئی بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ اور یہی ان کے لئے موت کا پیغام بنتا جا رہا ہے!"

تنویر: (کچھ سوچتے ہوئے) صدمہ؟

ڈاکٹر صاحب: ہاں کوشش کیجئے کہ معلوم ہو سکے۔

تنویر: جانتی ہوں اس صدمہ کا خیال ——— لیکن وہ درد لا دوا ہے، اس کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر غنی: ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اتنا تو میں ضرور جانتا ہوں کہ اس کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا۔ اب وہ گھڑی دو گھڑی سے زیادہ کا معاملہ باقی نہیں ہے، لیکن اس آخر وقت اگر وہ صدمہ دور کیا جا سکتا ہے، تو یقیناً جان آسانی سے نکلتی!"

تنویر: (روتے ہوئے) یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟

ڈاکٹر غنی: اب وقت آگیا ہے کہ صاف صاف اور سچی سچی بات کہہ دی جائے۔ حمیدہ میں اب کچھ نہیں رکھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ گھنٹہ دو گھنٹہ کی مہمان ہیں!"

تنویر: (بھرائی ہوئی آواز میں) ڈاکٹر صاحب؟

اور پھر ہچکیاں اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

ڈاکٹر غنی: میں ابھی مریضہ ہی کے پاس سے آ رہا ہوں، حالت بہت نازک ہے، چل چلاؤ کا وقت آ چکا ہے!"

تنویر: لیکن اگر اس کا غم دور کر دیا جائے، اس کے صدمہ کا سبب ختم کر دیا جائے، تو کیا بچ جائے گی؟

ڈاکٹر غنی: نہیں!

تنویر: تب بھی نہیں بچے گی؟"

ڈاکٹر غنی: نہیں! ——— سانس اکھڑ چکی ہے۔ نزع کا عالم طاری ہو چکا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر صدمہ کا سبب دور کر دیا جائے تو دم سکون سے نکلے گا۔ یہ ضرور ہو سکتا ہے ———!"

تنویر: (روتے ہوئے) ہائے کیا حمیدہ مر جائے گی؟

ڈاکٹر غنی: سب کو ایک دن مرنا ہے کوئی پہلے مرتا ہے، کوئی بعد میں۔ ولی، نبی، بادشاہ، فاتح، حکیم، ڈاکٹر، مزدور، سرمایہ دار، دولت مند، غریب، جوان، بوڑھا، بچہ، مرد، عورت، کسی کو بھی موت سے مفر نہیں۔ سب کو مرنا ہے اور اسی وقت مرنا ہے۔ جو خدا کی طرف سے مقرر ہو چکا ہے۔ خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا وقت پورا ہو چکا ہے۔ اب حمیدہ زندہ نہیں رہ سکتیں!"

تنویر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سیدھی حمیدہ کے کمرے میں پہنچی، واقعی اس کا دم واپسیں تھا۔ احسن میاں سرہانے بیٹھے یٰسین شریف پڑھ رہے تھے، دم اکھڑ چکا تھا، آنکھیں بار بار کھلتی اور بند ہوتی تھیں ———

رشیدہ، خالد سب ہی جمع ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔
"کہو بھئی خالد میاں! کیا کیا تحفے ملے تمہیں آج؟"
خالد نے عورتوں کی طرح شرماتے ہوئے کہا: "
میں تو نہیں جانتا، اماں کو معلوم ہوگا!
ڈاکٹر صاحب ہنسنے لگے"
بڑے سعادت مند ہو خدا نظرِ بد سے بچائے!"
رشیدہ نے کہا:۔
"بھائی صاحب! دوسروں نے کیا تحفے دیئے، یہ چھوڑیئے
یہ بتایئے آپ نے بھی کوئی تحفہ دیا؟"
ڈاکٹر صاحب جز بز ہو کر ——— کیا ہم باہر ہیں کسی
طرح؟"
"سوچ لیجئے، جو مانگوں گی دینا پڑے گا، لے کر رہوں گی۔ میری
ضد آپ جانتے ہی ہیں!"
ڈاکٹر صاحب: ہاں خوب جانتا ہوں"
رشیدہ: تو پھر وعدہ کرتے ہیں"
ڈاکٹر صاحب: ہاں بھئی ہاں!"
رشیدہ: دیکھو آپا گواہ رہنا"
حسینہ: مجھے بیچ میں نہ ڈالو، تم جانو اور تمہارے بھائی صاحب
جانیں"
رشیدہ:۔ تو سن لیجئے بھائی صاحب! اب آپ شادی کر لیں گے
ڈاکٹر صاحب: (قہقہہ لگاتے ہوئے) بڑی بے وقوف ہو!

# سناٹا

آج طلاور منزل میں پھر تقریب ہو رہی تھی۔ رشیدہ اب اس گھر کی مستقل مکین تھیں، ان کے صاحبزادے بلند اقبال خالد میاں، ملیریا میں کئی دن تک مبتلا رہنے کے بعد اچھے ہوئے تھے۔ ان کا غسلِ صحت آج بڑی دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا۔ رشیدہ اور حسینہ کی خوشی حد بیان سے باہر تھی۔ اندر اور باہر مہمانوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ جو آیا، وہ گیا، وہ گیا، یہ گیا، مردوں اور عورتوں کا وہ ہجوم کہ خدا کی پناہ! ڈاکٹر صاحب کو بھی اس تقریب سے اتنا تعلق خاطر تھا کہ آج شام کا مطب بھی نہیں کیا۔ زیادہ تر گھر میں بیٹھ کر سالی سے اٹکھیلیاں کرتے رہے۔

وہ اس وقت اپنے کمرہ میں رونق افروز تھے جب حسینہ، نوشابہ

مانگی بھی وہ چیز جو پہلے سے ملکہ ہمیشہ سے تمہاری ہے ۔

رشیدہ: دیکھئے بھائی جان! کچی ری بھی نہ جانے گا اپنے قول سے۔ ان باتوں سے لوشناہ پر تکدر اور برہمی کی کیفیت طاری ہوگئی! لیکن بڑوں کی باتوں میں دخل بھی نہیں دے سکتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے رشیدہ کی آخری بات کا ابھی جواب نہیں دیا تھا کہ دیکھتے کیا ہیں ایک چادر میں لپٹی ہوئی سامنے کھڑی ہے۔ سر کے بال الجھے ہوئے، چہرہ پر اضطراب و اضطرار کی کیفیت طاری، اس رنگ میں اسے دیکھ کر نہ صرف ڈاکٹر صاحب گھبرا گئے بلکہ حسینہ اور رشیدہ کو بھی تشویش ہوئی کہ ماجرہ کیا ہے؟

ڈاکٹر صاحب نے تنویر سے کہا:-

"ارے تم کہاں راستہ بھول پڑیں تنویر؟ ——
آؤ بیٹھو۔ رشیدہ، تنویر کے لئے کوئی اچھی مٹھائی لاؤ۔ یہ مٹھائی کی بڑی شوقین ہے۔"

تنویر: شکریہ! —— لیکن معاف کیجئے، مٹھائی کھانے نہیں آئی ہوں۔

ڈاکٹر صاحب:- اچھا نہ کھاؤ، بیٹھو تو، آدمی تو بنو، یہ تمہیں آج ہوا کیا ہے؟

تنویر:- کچھ نہیں —— مجھے افسوس ہے کہ آپ کی خوشی میں خارج ہوئی، لیکن بات ہی ایسی ہے۔

ڈاکٹر صاحب:- تو کہو بھی کچھ —— کیا بات ہے؟

تنویر:- رشیدہ اور بھائی تو شاید یہ خبر سن کر خوش ہوں، لیکن اگر خون



ہوگا کہ حمیدہ اس دنیا سے رخصت ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب: ہے ہے تالی ہے، کیا؟

تنویر: اگر آخری وقت اسے دیکھنا چاہتے ہیں تو چلئے اور دیر ہوئی، تو شاید اسے زندہ نہ دیکھ سکیں۔ میں نے کتنی کوشش کی کہ اس کی بیماری کی خبر آپ کو کر دوں، مگر وہ نہ مانی! اس کی ضد کے سامنے میں بے بس ہوگئی۔ اب اس کی سانس اکھڑ چکی ہے۔ نزع کا عالم طاری ہے۔ ڈاکٹر غنی نے صاف صاف کہہ دیا ہے، گھڑی دو گھڑی سے زیادہ کا امکان نہیں بتایا ہے۔ وہ آپ کے غصہ پر رشیدہ کی بھائی بھائی پر بھائی کے کینہ پر لوشناہ کی محبت پر قربان ہوگئی ہے اب وہ مر رہی ہے، دم لبوں تک آ چکا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب:- تنویر ——؟

اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے، رونے لگے۔

تنویر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

"بھائی صاحب مجھ سے بھی خفا ہو جائیے، میری صورت بھی کبھی نہ دیکھئے گا، میری دعوت بھی کبھی قبول نہ کیجئے گا، میرے گھر میں بھی لوشناہ کو کبھی نہ آنے دیجئے گا، لیکن خدا کے لئے اس وقت رحم کیجئے! اپنی جوان جہان بہن پر ترس کھائیے۔ وہ اب کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ خدا کے لئے اسے سکھ سے مرنے دیجئے! چلئے اٹھئے —— آئیے میرے ساتھ!"

ڈاکٹر صاحب: ہاں تنویر! میں چلوں گا، مجھے لے چلو —— ظالم تو آئی ہے میرے پاس، پہلے کیوں نہ آئی؟

تنویر! حمیدہ نے منع کر دیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب: اچھا چلیں! اب کیا سوچ رہی ہے؟

تنویر: آپ اکیلے نہیں چلیں گے۔"

ڈاکٹر صاحب: ہاں میں اکیلا نہیں چلوں گا، حسینہ تم بھی چلو! سوچ مت کھڑی ہو جاؤ۔"

تنویر: نہیں بھائی نہیں جائیں گی۔"

ڈاکٹر صاحب: کیوں؟

تنویر: انہیں دیکھ کر ان کو صدمہ ہوگا، مرتے وقت صدمہ نہ پہنچائیے اس جان بلب کو۔"

ڈاکٹر صاحب: اچھا حسینہ تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔"

تنویر: لیکن بھائی صاحب آپ اکیلے نہیں جائیں گے۔"

ڈاکٹر صاحب: کہو تو سارے گھر کو اپنے ساتھ لے چلوں ——— لیکن منزل کیوں کھوٹی کر رہی ہو پھر کون جائے گا میرے ساتھ۔"

تنویر: نوشابہ ——

ڈاکٹر صاحب: نوشابہ ———؟

تنویر: جی ہاں! شاید وہ گھنٹہ بھر پہلے مر گئی ہوتی لیکن اس کا دم نوشابہ میں اٹکا ہوا ہے —— نوشابہ کو دیکھتے ہی مر جائیں گی، لیکن سکون سے! ——— آپ اسے زندگی میں خوش نہ رکھ سکے، سکون سے مرنے تو دیجئے ———"

ڈاکٹر صاحب نے نوشابہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا اور تنویر



سے کہا: —

"چلو!"

تنویر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ باہر آئی ٹیکسی تیار کھڑی تھی۔ یہ تینوں اس میں بیٹھ گئے اور وہ ہوا سے باتیں کرتے روانہ ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب بار بار رومال سے آنکھیں پونچھ رہے تھے۔ نوشابہ گم سم بیٹھی تھی۔ تنویر کی سسکیاں اور ہچکیاں اتنی شدید تھیں کہ راستے کے شور اور رفتار کی گڑگڑاہٹ میں بھی سنائی دے رہی تھیں۔"

# آخری وقت

ڈاکٹر صاحب پر اس وقت عجب کیفیت طاری تھی حقیقت یہ تھی کہ وہ حمیدہ کو بہت چاہتے تھے یہی ایک بہن تھی اور بہن کیسی؟ بہ ہمہ صفت موصوف! لیکن طبعاً ذرا بے پروا قسم کے آدمی تھے۔ زود رنج بھی اور کانوں کے کچے بھی۔ بہتیرا ہی کوشش کی کہ حمیدہ مہمان بن کے نہ رہے لیکن اس کی خودداری نے بھائی کا ممنونِ کرم ہونا نہ چاہا۔ وہ مروتاً کہہ سن کر خاموش رہے۔ دل میں سوچا آخر جائے گی کہاں؟

جو تندرست بھی نکلے گی میں ہی اس کی تکمیل کروں گا۔ مطب کی مصروفیت کے باعث زیادہ بات چیت کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔ دل میں مطمئن تھے کہ نظر کے سامنے ہے، خوش ہے۔ بس یہ کافی تھا۔ ادھر اندر ہی اندر حسینہ کی سازشیں اور رشیدہ کی مکاریاں کام کرتی رہیں۔ یہ حمیدہ سے بے پروا ہونے لگے۔ پھر جب وہ یہاں سے چلی گئی اور اس کے جانے کے

جو نقشے ان دونوں بہنوں نے کھینچے، وہ اتنا بھیانک تھا کہ واقعی خفا ہو گئے انہوں نے نہ سوچا نہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ حمیدہ کے گھر چھوڑنے کے اصلی اور حقیقی اسباب کیا ہیں؟

حسینہ اور رشیدہ کی باتوں پر اعتبار کر لیا اور روٹھ گئے لیکن یہ خفگی ویسی ہی تھی جیسی بھائی بہن میں ہو سکتی ہے۔ سوچا تھا کسی موقع پر بہن کو ڈانٹ ڈپٹ دوں گا اور پھر منا لوں گا۔ لیکن حالات کیا پلٹا کھا رہے تھے۔ اس سے بے خبر تھے۔"

موٹر ہوا سے باتیں کرتی چلی جا رہی تھی اور وہ گم صم بیٹھے تھے۔

وہ سوچ رہے تھے کہ حمیدہ کو کس حال میں پاؤں گا؟ کیا وہ زندہ ملے گی؟

کہیں ایسا نہ ہو، وہاں پہنچوں تو وہ دم توڑ چکی ہو۔

پھر سوچنے لگے:

"میں نے حمیدہ کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ جب تک قاسم زندہ تھا، اس گھر میں اس کی بڑی شان تھی۔ قاسم کی الم انگیز ہلاکت کے بعد میں اپنی مصروفیتوں میں ایسا گھرا رہا کہ اس سے رابطہ نہ قائم رکھ سکا۔ مل گئی تو باتیں کر لیں، نہ ملی تو پوچھا بھی نہیں۔ بے شک میرے اس تغافل کا سبب یہ اطمینان تھا کہ اب وہ مہمان نہیں، اس گھر کی مستقل مکین ہے لیکن حمیدہ نے شاید اسے میرے تغافل پر محمول کیا اور آخر ایک دن روٹھ کر چلی گئی۔"

اگر تندرست ہو گئی تو پھر زبردستی ولا منزل لے آؤں گا۔ وہ وہیں رہے گی اور اب انشاء اللہ اسے کہیں بھی نہیں جانے دوں گا

کہ اس سے غافل ہوں۔ غافل تو میں کبھی بھی نہ تھا، ہاں مصروف ضرور تھا۔ اور اس مصروفیت کو اس نے تغافل سمجھ لیا۔ بہرحال اب زندگی بھر شکایت کا موقع نہ دوں گا۔ وہ میری محبوب اور چہیتی بہن ہے۔ کسی طرح نوشابہ سے کم اسے نہیں جانتا۔"

کار ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ تنویر اتر آئی۔ نوشابہ بھی پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب ویسے ہی اپنی سیٹ پر بیٹھے رہے۔ تنویر نے سر اندر ڈال کر کہا:

"بھائی صاحب آیئے!"

وہ چونک پڑے۔ رومال سے آنسو پونچھے اور اتر آئے، کہنے لگے:

"گھر آ گیا۔"

وہ بولی:۔

جی ہاں بھائی صاحب آ گیا!

ایک ٹھنڈا سانس لے کر بولے:

"چلو ——————"

یہ چھوٹا سا قافلہ اندر داخل ہوا۔ احسن میاں لیٰسین شریف کی تلاوت کر رہے تھے۔ آنکھوں سے آنسو بہتے جا رہے تھے آواز بھرائی ہوئی۔ لیکن تلاوت میں مشغول تھے۔ نشاط سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ آنکھیں برس رہی تھیں، سارے بدن پہ لرزہ طاری تھا۔ بار بار ہونٹوں کو دانتوں سے دبایا جاتا تھا۔ کہ کہیں چیخ نہ نکل جائے۔ حمیدہ چپ چاپ دروازے کی



طرف ٹکٹکی لگائے بستر پر پڑی تھی۔ سانس زور زور سے چل رہی تھی۔ اتنے میں تنویر افتاں خیزاں آئی اور دروازے ہی سے چیخی:

"حمیدہ بھائی صاحب آ گئے!"

حمیدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے، آنکھیں بند ہو گئیں۔

تنویر پھر چیخی:

"حمیدہ، نوشابہ بھی آ گئی، دیکھو یہ رہی کھڑی ہے تمہارے پاس!"

حمیدہ نے آنکھیں کھول دیں۔ پتلی خود بخود نوشابہ کی طرف گھوم گئی۔ نوشابہ آگے بڑھی، وہ بڑی طرح رو رہی تھی حمیدہ نے اپنا کمزور اور کانپتا ہوا ہاتھ اٹھایا۔ تنویر نے نوشابہ کو آگے بڑھا کر اس کے سینہ پر جھکا دیا وہ کمزور اور کانپتا ہوا ہاتھ اس کی پیٹھ پر جم گیا۔ جلدی جلدی آنسو کے قطرے گرنے اور گال پر ادھر ادھر لڑھکنے لگے۔

نوشابہ چیخی:۔

"میری پھپھی جان ——————!"

اور پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی سسکیاں لینے لگی۔

حمیدہ کا جو ہاتھ اس کی پیٹھ پر دھرا ہوا تھا، وہ کوشش کے باوجود اٹھ نہ سکا۔ ہاں ایک خفیف سی لرزش ضرور پیدا ہوئی۔ گویا وہ اس کی پیٹھ تھپکنا چاہتی تھی۔ اسے دلاسا دینا چاہتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب، اب تک بیکر یاس و حسرت بنے، ضبط و صبر سے کام لے رہے تھے، اب ضبط کا دامن چھوٹ گیا، بہت زور سے چیخے!"

"حمیدہ ———— میری بہن ————!"

حمیدہ کے ہونٹوں پر خفیف سی، بہت ہی خفیف سی تبسم کی جھلک نظر آئی۔ اس کا ہاتھ اب تک نوشابہ کی پیٹھ پر رکھا تھا۔ پھر اسکی پتلیاں دفعتہً شاہد کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ اب تک اسی طرح سر جھکائے آنسو بہا رہا تھا۔ نوشابہ نے یہ کیفیت دیکھ لی لپک کر اس نے شاہد کا سر بھی ماں کے سینہ پر رکھ دیا اور چیخ کر کہا:

"حمیدہ، یہ ہے شاہد!"

حمیدہ کا ہاتھ بدستور نوشابہ کی پیٹھ پر رکھا رہا، البتہ نظریں شاہد کی طرف اٹھ گئیں۔ تنفس میں اور زیادہ تیزی پیدا ہوگئی۔

ڈاکٹر صاحب نے پکار کر کہا:

"حمیدہ خدا کو یاد کرو!"

حمیدہ کے ہونٹ ہلے جیسے وہ "اللہ" کا لفظ کہہ رہی ہو پھر ———— ہونٹ بند ہوگئے، آنکھیں پتھرا گئیں، گردن ڈھلک گئی ———— وہ مرگئی!"

... ڈاکٹر صاحب کھڑے کھڑے پختہ فرش پر گرے اور بے ہوش ہوگئے!"

—



# دل دوز سانحہ

حمیدہ کی خبر وفات آناً فاناً ولا در منزل پہنچ گئی۔ حسینہ بیگم ہانپتی کانپتی دوڑی دوڑی آئیں۔ ان کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی جھڑیاں لگی تھیں وہ حمیدہ سے خفا تھیں، بیزار تھیں۔ اس کی غربت سے متنفر تھیں، لیکن وہ مر جائے۔ یہ نہ چاہتی تھیں۔ انھیں واقعی صدمہ ہوا، حمیدہ کے مرنے کا۔ ڈاکٹر صاحب کو ہوش آچکا تھا مگر اس صدمہ نے ذرا دیر میں انہیں بے حد کمزور کر دیا۔ کئی دوست ڈاکٹر اطلاع ملتے ہی آگئے۔ انھیں ایک دوسرے کمرے میں بستر پر لٹا دیا گیا تھا۔ سکون انجکشن دیے جارہے تھے۔ سکون آور دوائیں دی جارہی تھیں اور جب کسی طرح حالت نہ سنبھلی تو ڈاکٹر علی نے خواب آور گولیاں کھلادیں۔ ان کا اثر ہوا اور ذرا دیر میں وہ سوگئے۔ حسینہ جب پہنچی تو وہ سو رہے تھے۔ وہ سیدھی حمیدہ کے کمرے میں گئی۔ اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ شاہد کو گلے سے لگایا۔

اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اتنی ہی دیر میں رشیدہ بیگم بھی اپنے شوہر الزار میاں سمیت تشریف لے آئیں، چہرہ ان کا بھی اترا ہوا تھا! لیکن چہرے پر تکدر کے آثار بھی تھے۔ شاید وہ قدرت پر برہم تھیں! اتنے نا وقت حمیدہ کی جان لے کر کیوں ان کے جشن میں خلل ڈالا۔ انور صاحب اس کمرہ میں جا کر بیٹھ گئے۔ جہاں ڈاکٹر صاحب دوا کے زور سے بستر خواب پر دراز تھے۔ رشیدہ جا کر تنویر کے پاس بیٹھ گئی۔ تنویر بے چاری اس وقت عجیب کشمکش میں تھی۔ ایک طرف ایک طرف حمیدہ کی محبت نے غم کے سمندر میں ڈبو دیا تھا دوسری طرف شاہد کی حالت دیکھ کر کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ تو شاہد کی خاموشی، لیکن نگاہوں سے وہ بہت متاثر تھی پر سہ دینے کے لئے خاطر داشت بھی اسی کو کرنا پڑتی تھی۔ بار بار احسن میاں کو ہدایتیں بھی دیتا جاتی تھیں۔ طے یہ ہوا تھا کہ تجہیز و تکفین صبح اوّل وقت کر دی جائے۔ کبھی وہ احسن میاں کو ہدایتیں دیتیں کبھی شاہد کو دلاسا دیتی اور شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی۔ کبھی تو شاہد کو پیار کرتی۔ کبھی ذرا دیر کے لئے حمیدہ کے پاس جا کر بیٹھ جاتی کبھی دوسرے کمرے میں جا کر ڈاکٹر صاحب کی خیریت دریافت کر آتی۔ کبھی رشیدہ کے بے تکے اور بے موقع سوالوں کا جواب دیتی، کبھی گھر کے نوکروں کو ضروری کاموں پر متوجہ کرتی ——— اور رونی بھی جاتی! اتنی ہی دیر میں اس کی آنکھیں روتے روتے سرخ ہو گئیں تھیں، پپوٹے پھول گئے تھے۔ لیکن وہ اپنی حالت سے بے خبر، کام میں لگی تھی ——— جیسے مشین!"

ساری رات اسی طرح گزر گئی۔ کسی ایک منٹ کے لئے پلک بھی

"نہ پوچھیں، ہاں ڈاکٹر صاحب سوتے رہے۔

صبح ہوتے ہوتے اطلاع ملی کہ قبر تیار ہو گئی ہے۔

درزی آ گیا۔ وہ اطمینان سے کفن سینے بیٹھ گیا۔

شاہد کو حمیدہ بیگم اب تک اپنے پاس بٹھائے تھیں۔ کبھی رونے لگیں رونے سے ذرا فرصت پاتیں تو اس کے سر پر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگتیں، پھر شوہر کا خیال آتا اور بے تاب ہو کر دوسرے کمرہ میں جاتیں وہاں انور اور ڈاکٹر غنی سے کیفیت دریافت کرتیں۔ چادر اٹھا کر آنکھا دیکھتیں نبض ٹٹولتیں، ڈاکٹر غنی سے پوچھتیں:-

"کب تک جاگ جائیں گے؟"

وہ فرماتے:

"اطمینان رکھئے، بہت جلد جاگ جائیں گے ——— میں چاہتا ہوں اس وقت جاگیں، جب حمیدہ بیگم کی تجہیز و تکفین ہو چکے!"

وہ کہتیں!-

"یہ رائے تو آپ کی ٹھیک ہے۔ لیکن خدا نخواستہ کوئی خطرہ تو نہیں انشاء اللہ اعظم ———؟"

اور پھر کچھ نہ کہہ سکتیں، ہونٹ کانپنے لگے۔ آنسو بہنے لگے، ڈاکٹر ڈاکٹر غنی تسلی دیتے!"

"ذرا نہ گھبرایئے، ہمارے ڈاکٹر صاحب ہر خطرہ سے آزاد ہیں۔ صدمہ ضرور سخت ہے! ہونا بھی چاہئے، ایسی اچھی بہن، یوں اچانک داغ جائے! پتھر کا دل بھی پانی ہو جائے گا، ویسے یقین کیجئے، قلب کی

حالت درست ہے نبض بالکل ٹھیک چل رہی ہے۔"

ان باتوں سے مطمئن ہوکر اپنے دل کو تسلی دیتی ہوئی اسی کرہ میں آجاتی اس وقت نہ انھیں رشیدہ کی فکر تھی نہ نوشابہ کی پروا، دونوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا بس صرف شاہد کی دلجوئی میں لگی تھیں۔ اسے روتا دیکھ کر خود بھی روتے روتے کہتیں:

"میرے بچے! کیوں روتا ہے، میں تو زندہ ہوں! کیا میں تیری ماں نہیں؟ نوشابہ کو دیکھو وہ اپنی ماں کے لئے کس طرح بلک بلک کر رو رہی ہے ——— بہن میرے بچے روتے نہیں ——!"

یہ کہہ کر اسے چمٹا لیتیں اور آنسوؤں کا بادل برسنے لگتا۔ شاہد کے دل کو ماں کی اچانک موت کا جو زبردست صدمہ پہنچا تھا وہ ان باتوں سے کسی قدر ہلکا ہو جاتا۔ وہ محسوس کرنے لگتا جیسے اس کی واقعی دو مائیں تھیں۔ ایک کو خدا نے اپنے پاس بلا لیا، دوسری موجود ہے زندہ ہے اور یہ سوچ کر غم کے بادل چھٹ جاتے ——— غم کا بوجھ کسی حد تک ہلکا ہو جاتا۔ آج بہت دنوں کے بعد اس نے حسینہ کی زبان سے شفقت اور محبت کے جملے سنے تھے، آج بہت دنوں کے بعد حسینہ بیگم کی بھرپور محبت کا جلوہ پھر اس نے دیکھا تھا، ———

وہی بھرپور محبت جسے وہ بھول چکا تھا، جس کے لئے وہ ترستا رہا تھا، حسینہ بیگم کے میٹھے بول جب کانوں میں پڑے تو ایک قسم کا سکون سا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا غم بانٹنے کے لئے جا رہا ہے۔ جیسے کوئی اسے اطمینان اور سکون کی نعمت پھر سے واپس دے رہا ہے۔"



لیکن جب نظر اس چارپائی پر پڑتی جس پر اس کی ماں ہمیشگی کی نیند سو رہی تھی تو پھر دل تہ و بالا ہونے لگتا۔ پھر جذبات قابو سے باہر ہو جاتے، اور کوشش کے باوجود پھر آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار گرنے لگتا گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا، حمیدہ کے آخری سفر کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں!"

# عجب انتقام

دنیا بھی کیا چیز ہے۔ نہ اس کی رونق کو قرار ہے، نہ اداسی کو، نہ غم کو، نہ خوشی کو، نہ امارت کو، نہ غربت کو، نہ دوستی کو، نہ دشمنی کو، نہ محبت کو، نہ نفرت کو!"

حمیدہ آخری منزل تک پہنچا دی گئی۔ ڈاکٹر صاحب بچوں کی طرح پچھاڑیں کھا رہے تھے۔ تنویر پہ بار بار بے ہوشی کے دورے پڑتے تھے۔ حسینہ کا چہرہ اس طرح سفید تھا جیسے کسی نے سارا خون کھینچ لیا ہو جیسے بھیگے ہوئے کپڑے سے پانی نچوڑ لیا ہو۔ شاید اور لوگوں پہ ایسا کوہِ الم ٹوٹا تھا کہ ان کی ہنسی، خوشی، مسرت، شوخی، شرارت ہر چیز چھن گئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کئی روز تک بستر علالت پر دراز رہے۔ حمیدہ کی موت



نے انہیں نیم جان کر دیا تھا۔ ضمیر بار بار ملامت کرتا تھا۔ پچھلی باتیں ایک ایک کر کے یاد آتی تھیں۔ وہ اس کی محبت، وہ اس کی شرافت، وہ اس کی سچائی ایک ایک بات یاد آ کر کانٹے کی طرح دل میں کھٹکنے لگتی تھی۔ حسینہ چارپائی پر تو نہ پڑی لیکن حالت اس کی بھی غیر تھی۔ اس نے امید اور توقع سے زیادہ حمیدہ کا سوگ منایا۔ شاید ضمیر کی خلش اس کے لئے بھی بلائے جان بنی ہوئی تھی۔ تنویر پر اس نے محبت اور شفقت کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ اپنے گذشتہ تلخ برتاؤ کو اس کے صفحۂ دل سے مٹا دینا چاہتی تھی اور بڑی حد تک اس مقصد میں کامیاب بھی تھی۔ شاید اگر غیر معمولی طور پر حساس لڑکا نہ ہوتا تو اب تک شاید حمیدہ کو بھول چکا ہوتا! اس لیے حسینہ کے دامن میں اسے وہی اطمینان اور سکون مل رہا تھا جو صرف ماں کے دامن میں مل سکتا تھا۔"

ایک رشیدہ تھی جو عجیب قسم کی ذہنی کشمکش میں گرفتار تھیں، نہ ہنستے بنتا تھا نہ روتے۔ ڈاکٹر صاحب کی سینہ کوبی سمجھ میں آسکتی تھی، تنویر کی ماتم گساری کوئی خلافِ توقع بات نہ تھی۔ لو شاید اگر حسن کے آنسو سچے تھے تو اسے بھی کلیجہ پر پتھر رکھ کر کسی نہ کسی طرح کچھ عرصہ کے لئے برداشت کیا جا سکتا تھا۔ شاید اگر یہ بھی غم نظر آتا ہے، تو ایسا ہونا ہی چاہئے تھا۔ پہلے باپ کو کھایا، پھر ماں کو بھی چٹ کر گیا۔ اب کون ہے، جس کے سہارے وہ دنیا کی لذتیں اور نعمتیں حاصل کرے گا!"

لیکن کسی طرح بھی سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی وہ حسینہ بیگم کا سوگ تھا

وہ سوچا کرتی، آخر آپا کو کیا ہو گیا ہے جو خوش ہونے کے بجائے آنسو بہا رہی ہیں؟"

اس کا خیال تھا، حمیدہ کی موت نے راستہ کا بہت بڑا پتھر ہٹا دیا اگر وہ زندہ رہتی تو کسی وقت بھی ڈاکٹر صاحب بہن کی محبت میں بھٹک سکتے تھے۔ اب وہ مر چکی تھی۔ اب راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ اب کسی طرح کا اندیشہ نہیں تھا۔ لیکن پکائی بھی کھیر اور ہو گیا دلیا۔ حمیدہ کیا معلوم ہوتا تھا۔ سارے گھر کو موت نے اپنے دامن میں ڈھانپ لیا۔ نہ ہنسی، نہ خوشی، نہ قہقہے، نہ سیر، نہ تفریح۔

وہ سوچا کرتی تھی انتقام کی بہت سی کیفیتیں میری نظروں سے گزری ہیں۔ لیکن حمیدہ نے مر کر جیسا انتقام لیا ہے وہ تو وہم و گمان سے بھی خارج ہے۔" اس سے تو بہتر تھا کہ زندہ رہتی۔ زندہ رہتی تو ہم اسے جلاتے، کڑھاتے، ستاتے، نوشابہ کو اپنا لیتے ... اور وہ منہ دیکھ کر رہ جاتی! لیکن مرتے ہی اس نے بازی ماری، وہ مر گئی، لیکن ہم جل رہے ہیں، کڑھ رہے ہیں، ستائے جا رہے ہیں، نوشابہ ہماری ہے لیکن نہ ہم اسے ورغلا سکتے ہیں نہ اس کے آنسو پونچھ سکتے ہیں۔ آخر کیا مذاق ہے؟"

رشیدہ گھنٹوں دوپہر دن، حسب معمول آپا، یعنی حسینہ کے پاس آکر بیٹھتی تھی۔ اب تو گھر بھی ایک ہو گیا تھا، مستقل قیام دلاور منزل ہی میں تھا۔ دن میں کئی کئی مرتبہ حسینہ کے پاس جانے اور اٹھنے بیٹھنے کے مواقع ملتے تھے۔ لیکن اب تو وہ حال تھا کہ دونوں بہنیں بیٹھتیں اور حمیدہ میں کیڑے نکالے جانے لگے۔ شاہد کی سچی اور جھوٹی باتیں نکالتیں ——

سچی بالکل نہیں اور جھوٹی بہت زیادہ —— تمکنتیں آپس میں شروع ہو گئیں۔ یا اب یہ حال تھا کہ وہ آئی، بیٹھی، پاندان اپنی طرف کھسکایا، ایک پان بنا کر خود کھایا، دوسرا آپا کو دے دیا، آپا نے چپ چاپ پان لے کر منہ میں رکھ لیا اور جبڑا چلنے لگا۔ اس نے چھالیا کترنا شروع کی اور کترتے کترتے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ لیکن آپا ہیں کہ چپ بیٹھی ہیں اور ٹھنڈی سانسیں لے رہی ہیں کبھی کبھی آنکھوں میں آنسو بھی چھلک آتے ہیں ——

آخر یہ کس قسم کی زندگی ہے؟ اس طرح کیسے گزر ہوگا۔ یہ بھی کوئی زندگی میں زندگی ہے؟ یہی سوچتے سوچتے وہ تیوری چڑھا کر اٹھتی اور دل ہی دل میں بڑبڑ کر چلی جاتی، لیکن آپا جھوٹوں منہ بھی نہ پوچھتیں۔ کیسے آئیں، کیسے چلیں؟ آئی ہو تو کچھ دیر بیٹھو، باتیں کرو ——!

یہ کچھ نہیں ہوتا ہاں شاہد کی خاطر مدارات میں ہلکان ہوئی جا رہی ہیں"

"ارے شہزادی! دیکھنا شاہد نے ناشتہ کر لیا یا نہیں؟"

"دیکھو جمعدار، شاہد کے جوتوں پر پالش کر دے، اس کے اسکول جانے کا وقت ہو گیا ہے ——"

"سبزی والی کہاں مر گیا —— کے دفعہ تاکید کر دی ہے کہ گوشت کے ساتھ گردے بھی ضرور لے کر آیا کرو، شاہد کو گردے اچھے لگتے ہیں۔ اگر آج نہ لایا تو تیری خیر نہیں ——"

کان پک گئے ہیں یہ باتیں سنتے سنتے!

بعض دفعہ تو جی چاہتا ہے کہ دھاڑیں مار دوں آپا سے، اگر حمیدہ کا اسی طرح سوگ منانا تھا اور باقی زندگی یوں ہی میاں شاہد کی پوجا میں صرف کرنی تھی۔ تو پھر مجھے اس گھر میں کیوں بلوایا ہے خود ہی مشورہ

دے کر بلوایا ہے اور اب خود ہی باقی سب سے بے خبر نوشابہ کی عبادت میں لگی ہوئی ہیں۔ اگر یہی کرنا ہے تو اپنا گھر سنبھالو، ہم چلے۔"

لیکن دل میں یہ خیالات آئے تھے۔ زبان کی نوک تک آنے سے گریز ہی کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ حسینہ کو ناراض کرنا مصلحت کے خلاف تھا۔ وہ صرف بڑی بہن ہی نہ تھی، نوشابہ کی ماں بھی تو تھی!

نوشابہ، سونے کی چڑیا!"



# شاہد

مغرب کا وقت تھا حسینہ نماز پڑھ کر اپنی چارپائی پر آکر بیٹھ گئی۔ پائنتی پر رشیدہ بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھی۔ اتنی محویت سے جیسے بڑا ضروری کام ہے۔ پاس ہی ایک کرسی پڑی تھی، اس پر نوشابہ بیگم براجمان تھیں۔

نوشابہ اس وقت بڑی خوش نظر آرہی تھی۔ حسینہ نے پوچھا:

"کیوں بچی آج کا پرچہ کیسا رہا؟"

نوشابہ نے خوشی کا جھولا جھولتے ہوئے کہا:

"بہت اچھا!"

"حسینہ، اگر پاس ہو گئی تو اچھا سا انعام دوں گی تجھے!"

"امی! نوشابہ سے ایسی مجھے کوئی نہیں بیٹ کر سکتا، اول آؤں گی، دیکھ لینا۔"

تسنیم :- خدا ایسا ہی کرے!

نوشابہ : بڑا غضب ہو جاتا آج، وہ تو اللہ نے خیر کی "

تسنیم : کیا ہوا میری بچی؟

نوشابہ : بس فیل ہو جاتی میں!

تسنیم : ارے یہ کیوں؟

نوشابہ : استانی نے کہا تھا تاریخ کے پرچے میں اکبر بادشاہ کا حال ضرور پوچھا جائے گا لیکن جب یاد کرنے بیٹھی تو لاکھ کتاب ڈھونڈتی ہوں، ملتی ہی نہیں!"

تسنیم :- بدحواس تو ہمیشہ کی ہو، ماشاء اللہ سیانی ہو گئی مگر اپنی چیزوں کو سلیقہ سے رکھنا نہ آیا!"

نوشابہ :- کیا کروں امی بھول جاتی ہوں "

تسنیم :- دھیان رکھا کرو اپنی چیزوں کا ——— ہاں پھر کیا ہوا؟"

نوشابہ : خالد بھائی ادھر سے گزرے، میں نے کہا اللہ میں اکبر بادشاہ کے بارے میں نوٹ لکھا دیجئے تو یاد کر لیں۔ بیٹھ گئے۔ وہ بولنے لگے میں لکھتی گئی "

رشیدہ :- دیکھو پاس ہونے کے بعد مٹھائی کھلانا پڑے گی تجھے خالد کو؟ "

نوشابہ : خالد اماں وہ تو کھلا دوں گی، لیکن واقعہ تو سنئے۔

رشیدہ :- سن رہی ہوں بیٹی! میری جان!"

نوشابہ : خالد بھائی نے جو کچھ لکھایا تھا، رات کو بارہ بجے



تک یاد کر کے سب میں نے ازبر کر لیا۔

حسینہ : بیٹی تمہیں پڑھ لکھ کر نوکری تو کرنی نہیں ہے کچھ اتنی محنت کیوں کرتی ہو کر دشمن بیمار پڑ جائیں؟"

نوشابہ : تو امی کیا پھر فیل ہو جاتی؟

رشیدہ : فیل ہوں تمہارے دشمن ——— تو یاد کر لیا سب کچھ جو خالد نے بتایا تھا؟"

نوشابہ : جی ایک ایک حرف یاد کر لیا۔ پھر صبح ہوئی مسیح شاہد بھائی مل گئے۔ کہنے لگے امتحان دینے جا رہی ہو، میں نے کہا ہاں، پوچھا تیاری کر لی؟ میں نے جواب دیا خوب اچھی طرح۔ یقین نہ ہو تو بیٹھے آپ ہی امتحان لے لیجئے۔ وہ بیٹھ گئے امتحان لینے سوال کیا، اکبر کے باپ کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا سکندر لودھی مسکرانے لگے۔ پھر پوچھا اکبر کے کتنے بیٹے تھے؟ میں نے جواب دیا تین۔ شاہجہان، عالمگیر، بابر۔ ایک قہقہہ لگایا، پھر کھڑے ہو گئے، کہنے لگے فیل ہونے سے بہتر یہ ہے کہ امتحان نہ دو۔ میں نے کہا، واہ رات کے بارہ بجے تک جاگ کر یہ مضمون یاد کیا ہے۔ آپ کہتے ہیں امتحان نہ دو، کیا میں نے سوالات کا غلط جواب دیا ہے؛ کہنے لگے بالکل غلط کس کتاب سے تم نے یہ نادر واقعات یاد کئے ہیں، میں نے کہا کتاب تو گم ہو گئی ہے۔ خالد بھیا نے مضمون لکھا دیا تھا۔ یہ کہہ کر میں نے مضمون آگے بڑھا دیا ان کی طرف، کہنے لگے اس میں تو ایک بات بھی صحیح نہیں ہے۔ پھر انہوں نے [illegible]

گھائیں اور کہا، انہیں یاد کرلو، پاس ہو جاؤگی۔"

رشیدہ: ہاں اور کیا ـــــــ تجھے آئے ولی اللہ
بن گئے موئے نمک حرام۔"

نوشابہ: میں تو بڑے چکر میں پھنس گئی، لیکن ان کی بتائی ہوئی باتیں
بھی یاد کرلیں۔

رشیدہ: اچھا مذاق ہے ...... میری بچی کو پریشان کر دیا، شاہد
کے بچے نے، میٹھے بتائے۔"

نوشابہ: سنئے تو خالہ جان!

رشیدہ: ہاں سن رہی ہوں بیٹی!

نوشابہ: اسکول میں استانی نے پوچھا، تیاری کرلی؟ میں نے کہا
جی ہاں، یہ پورا مضمون زبانی یاد کرلیا ہے۔ یہ کہہ کر میں نے
خالدہ باجی کا مضمون استانی کی طرف بڑھا دیا۔ اسے پڑھتے ہی
بگڑ گئیں۔ کہنے لگیں، ابھی وقت ہے واپس چلی جاؤ۔ امتحان دے
کر ولت... تو میں نے کہا نہیں استانی جی غلطی ہوگئی۔ وہ نہیں
یہ مضمون یاد کرلیا۔ تھیلے میں سے شاہد بھیا والا
مضمون ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اسے دیکھ کر پڑھتے ہی خوش ہوگئیں
کہنے لگیں ہاں یہ ٹھیک ہے، مجھ سے مذاق کر رہی تھی بچی۔
جا گھنٹی بج گئی امتحان ہال میں پہنچی، پرچہ آیا۔ تو وہی سوالات تھے
جو شاہد بھیا نے بتائے تھے۔ کھٹا کھٹ جواب لکھے اور میں
چلی آئی۔ امی اگر شاہد بھیا نے مدد نہ کی ہوتی تو واقعی میں فیل
ہو جاتی۔ صحیح طرح سے خالدہ بھیا کو کچھ آتا نہیں تو غلط بات

کیوں بتاتے ہیں؟"

حسینہ: ذرا سمجھی ہے، ابھی سے پوچھا۔

رشیدہ: تو کیا اس نے سمجھ کے غلط بات بتائی ہوگی؟

نوشابہ: اور نہیں تو کیا!

رشیدہ: کیا وہ تیرا دشمن ہے؟

حسینہ: اس میں دوستی اور دشمنی کا کیا سوال ہے، خالدہ کا چھوٹا
پن لگتا ہے ـــــــ میں کہتی ہوں، اس کی خبر لو۔
بڑی واہیات بات ہے۔ خدانخواستہ ہاتھ سے نکل گیا تو روتے نہیں
بنے گی!"

رشیدہ: واہ آپا! خدا نہ کرے وہ ہاتھ سے جائے۔ ہم نے
تو پھر منہ ایسی باتیں کہہ دیں کہ میرا دل دہل گیا۔"

حسینہ: لیکن دوستی میں کہی، میں دشمنی میں نہیں۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ شاہد باہر سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے
ماتھے پر پٹی بندھی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"کہو کیسا پرچہ رہا؟"
نوشابہ نے شکستہ ہوکر جواب دیا۔
"بہت اچھا! آپ کے بتائے ہوئے سارے سوالات آئے،
میں نے سب کر ڈالے ـــــــ یہ آپ کے پٹی
کیوں بندھی ہے۔ ماتھے پر؟"
شاہد نے بے پروائی کے ساتھ کہا۔
"کچھ نہیں، ذرا چوٹ آگئی تھی!"

حسینہ: چوٹ آ گئی ہے
شاہد: جی ہاں، ہاکی کھیل رہا تھا، ایک ساتھی کی اسٹک گیند کے بجائے میرے ماتھے پر پڑ گئی غلطی سے۔ بے چارے بہت نادم ہوئے۔

حسینہ: بھاڑ میں جائے اُن کی ندامت، تم نے بھی تان کے ایک اسٹک کیوں نہ لگا دی منہ پر، پھر تم بھی ندامت کا اظہار کر دیتے!"

شاہد ہنسنے لگا۔

نوشابہ: خون تو نہیں نکلا؟

شاہد: ذرا سا نکلا تھا۔

حسینہ: ذرا سا نکلا تھا، اب تک تو لال ہو رہی ہے پٹی۔ میرے خیال میں ابھی رس رہا ہے۔ جا کے اپنے ماموں کو دکھا تا کیوں نہیں؟

شاہد: اب تو درد نہیں ہے۔ ماموں کو خواہ مخواہ کیوں تکلیف دوں، وہ بھی پریشان ہو جائیں گے آپ کی طرح۔
ممانی جان کل سے میرا امتحان بھی شروع ہے۔"

حسینہ: ہاں معلوم ہے، خدا کامیاب کرے! اس سال انٹرنس کا امتحان دے رہے ہو یا اگلے سال دو گے؟

شاہد: میں تو ایف۔ اے کا امتحان دے رہا ہوں، انٹرنس تو مدت ہوئی پاس کر چکا۔"

رشیدہ: خالد تو انٹرنس کا امتحان دے رہا ہے۔"



شاہد: جی ہاں، پچھلے سال بھی انہوں نے انٹرنس ہی کا امتحان دیا تھا۔ نوشابہ مسکرانے لگی۔ حسینہ نے اپنا تبسم کامیابی سے روک لیا۔ رشیدہ نے ناگن کی طرح بل کھاتے ہوئے شاہد سے کہا:

"تو کا لگا دوں گی منہ میں، اگر مجھ سے زبان چلائی ہو گی۔"

شاہد نے کوئی جواب نہیں دیا، حسینہ بیگم نے سوال کیا:
"کیوں بیٹے، فیس داخل کر دی تم نے اپنی؟"

شاہد: ابھی تو نہیں!"

حسینہ: نوشابہ میرے صندوقچے سے شاہد کو فیس کے روپے لا کر دے دو۔"

شاہد: ایک روپیہ زیادہ لانا!

نوشابہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی، شاہد نے کہا:

"صبح مٹھائی کا وعدہ کیا تھا، اس وقت بھول گئیں؟"

نوشابہ مسکراتے ہوئے چلی گئی، ذرا دیر میں اس نے روپے لا کر شاہد کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ روپے لے کر وہ باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رشیدہ نے تیز کہا:

"حالت تو یہ ہے صاحبزادے کی کہ دوسروں کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔"

حسینہ نے بات بڑھنے نہ دی:
[illegible]

وہ دوسروں کے جھگڑوں پر کیوں پلنے لگا۔ بجائے بڑے اور بیٹے
میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

رشیدہ: ٹھیک ہے، یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تمہارا منہ بولا
بیٹا بھی تو ہے۔ پھر تو اسے کودنا ہی چاہیے۔ سچ ہے بچھڑا
کھونٹے کے بل کودتا ہے۔

حسینہ:- یہ لو، اب مجھ سے لڑنے لگیں!"

اتنے میں خالد صاحب تشریف لائے، آتے ہی ماں کے
پاس بیٹھ گئے۔ اسٹک ہاتھ میں تھا۔ اس سے شغل کئے جا
رہے تھے، بیٹھتے ہی نوشابہ سے پوچھا،

"کہو بھئی! امتحان دے آئیں!"

نوشابہ کو ہنسی آگئی اس نے جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا،
پھر آہستہ سے کہا:-

"جی ہاں! دے آئی ———— کیوں خالد بھائی کیا
آپ ہاکی کھیل کر آرہے ہیں؟"

خالد:- ہاں نوشابہ!"

نوشابہ:- یہ آپ کی اسٹک میں لال لال دھبے کیسے نظر آرہے ہیں؟

خالد:- یہ خون کے نشانات ہیں۔"

نوشابہ:- (سہم کر) خون؟

خالد:- ہاں بھئی خون! بڑی بزدل ہو ڈر گئیں۔"

رشید:- کھیلنے گئے تھے یا فوجداری کرنے؟
کیا لڑائی ہوگئی کسی سے؟"



خالد: مجھ سے کون لڑ سکتا ہے؟ ہاں میں نے پیٹ ضرور دیا
ایک صاحب کو!"

رشید:- آخر یہ مار پیٹ کس سے سیکھی ہے؟ کسے پیٹ آئے؟

خالد:- وہ ذات شریف جو آج میرے ہاتھ سے پٹے ہیں،
یہیں اس گھر میں رہتے ہیں۔"

حسینہ: کون ہے وہ؟

خالد: شاہد۔

حسینہ: تم نے شاہد کو مارا؟

خالد:- جی ہاں: ابھی ابھی تو یہیں سے باہر گئے ہیں۔ آپ نے
دیکھا نہیں حضرت کے ماتھے پر پٹی بندھی تھی؟ ———— میرا
خیال ہے خون اب تک رس رہا ہوگا زخم سے!

حسینہ: لیکن کیوں مارا تم نے؟

خالد: وہ اپنے آپ کو بڑا قابل سمجھنے لگے ہیں ———— [illegible]
جب میرا آمنا سامنا ہوا تو فرمانے لگے، خود بھی جاہل ہو اور
دوسروں کو بھی جاہل ہی دیکھنا چاہتے ہو، خود بار بار ایک درجے
میں فیل ہوتے ہو، چاہتے ہو وہ بھی فیل ہو جائے۔ آخر نوشابہ
کو اکبر پر اتنا غلط مضمون لکھانے کی کیا ضرورت تھی؟ ظاہر ہے
ان باتوں کا جواب زبان کی بجائے اسٹک ہی سے دیا جا سکتا ہے
سو میں نے دے دیا!"

حسینہ نے زبان سے کچھ نہ کہا لیکن چہرے کا اتار چڑھاؤ بتا رہا
تھا کہ یہ بات بہت ناگوار گزری، رشیدہ اٹھ کھڑی ہوئی اس نے

نوشابہ: آپ شاید بھیا کا، پھپھی جان کے مرنے کے بعد سے کتنا زیادہ لاڈ کرنے لگی ہیں۔ وہ تو نہیں بگڑے!

حسینہ:۔ وہ شریف ہے کبھی آنکھ سامنے کر کے بات نہیں کرتا سر جھکائے کھڑا رہے گا اور ایک یہ ہیں میاں خالد کل سے کر سامنے شہزادی کی چوٹی پکڑ کر مذاق فرما رہے تھے۔"

نوشابہ:۔ شاید بھیا کے کافی چوٹ آگئی ہے۔"

لیکن عجیب آدمی ہیں، انہوں نے بھی کیوں نہیں برابر سے مار لیا کیا کسی سے دبیل ہیں؟"

حسینہ: دبیل تو نہیں ہے لیکن لحاظ کرتا ہے میری وجہ سے بی رشیدہ کا، ان کی وجہ سے خالد میاں کا ورنہ اللہ رکھے کچھ کمزور تو ہے نہیں اگر دونوں میں لڑائی ہو جائے تو وہی زبر رہے گا۔"

نوشابہ:۔ ہاں اور کیا ــــــــــ لیکن امی یہ ہوا بہت برا۔"

حسینہ:۔ وہی تو میں بھی سوچ رہی ہوں۔"

نوشابہ:۔ ابا کو بتا دینا چاہئے۔"

حسینہ: نہیں بچی کیا فائدہ مفت میں بات بڑھے گی، جھگڑا فضیحتی ہوگی، میں رشیدہ کو جتا دوں گی، اب ایسا نہیں ہونا چاہئے۔

نوشابہ:۔ امی! خالد بھائی مجھے بھی بہت چھیڑا کرتے ہیں، جب دیکھو جب۔"

حسینہ: (تیوری پر بل ڈال کر) تجھے کیا ستاتا ہے؟"



# ماش کی دال

رشیدہ اور خالد کے چلے جانے کے بعد نوشابہ نے ماں سے کہا:۔

"دیکھ لیا آپ نے؟"

وہ بولی:۔

"ہاں بچی دیکھ لیا ــــــــــ جب سے یہ لوگ اس گھر میں آئے ہیں ایسی ہی عجیب عجیب باتیں دیکھ رہی ہوں! لیکن کہوں کس سے! اپنا گھٹنا کھولوں آپ ہی لاجوں مروں۔"

نوشابہ:۔ آخر خالد بھائی اتنے لڑاکا کیوں ہو گئے ہیں؟"

حسینہ:۔ اترائے ہیں لاڈلے بیٹے ہیں نا ماں باپ کے۔؟

نوشابہ: واہ کیا لاڈ سے کوئی بگڑ جاتا ہے؟"

حسینہ:۔ اور کیا بچی!"

نوشابہ: - ایک دن ملک نور جہاں کی اچھی سی تصویر لائے، میں نے کہا۔ مجھے دے دیجئے، اپنے البم میں رکھوں گی۔ کہنے لگے، خود ہی البم میں بیٹھ جاؤ۔ تم کیا کچھ کم ہو نور جہاں سے!"

حسینہ: (دانتوں تلے انگلی دبا کے) اچھا؟"

نوشابہ: - ہاں امی! مجھے ایسی باتیں ذرا اچھی نہیں لگتیں۔ شاہد بھیا تو ذرا نہیں ستاتے ہمیں۔"

حسینہ: - وہ کیوں ستانے لگا۔ شریف بچہ ہے! آوارہ اور لچا تو نہیں ہے۔

نوشابہ: ایک دن میرے البم میں کسی ایکٹریس کی تصویر دیکھ کر شاہد بھیا خفا ہو گئے۔ کہنے لگے، نوشابہ تم تو بہت اچھی لڑکی ہو، ایسی تصویریں رکھتی ہو اپنے البم میں؟ بری بات! میں نے کہا، حرج کیا ہے؟ کہنے لگے، بہت حرج ہے، ممانی جان دیکھیں گی تو بہت خفا ہوں گی، پھاڑ دو اسے؟ میں نے کہا، پھاڑ دیجئے، بس اسے پھاڑ کر ہنستے مسکراتے خوش خوش چلے گئے۔"

حسینہ: وہ تو ہیرا ہے ہیرا ——— اری شہزادی! — کہاں مر گئی ——— ہاں دیکھ، توبہ، کیا کہہ رہی تھی، یاد آ گیا: شاہد کو کھانا دے آئی ان کے کمرے میں؟"

شہزادی: - جی لے تو گئی تھی، مگر انہوں نے کھایا نہیں!

حسینہ: یہ کیوں؟

شہزادی: کہنے لگے، طبیعت سست ہے۔"



حسینہ: جا بلا لا ———۔

شہزادی، شاہد کو بلا لائی، وہ حسبِ معمول سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

حسینہ: بیٹھ جاؤ بیٹے ——— کھانا نہیں کھایا آج؟"

شاہد: جی نہیں، کچھ طبیعت سست ہے، حرارت سی محسوس ہو رہی ہے۔ میں نے کہا فاقہ کر لوں، صبح تک ٹھیک ہو جاؤں گا ———"

حسینہ: - واہ! فاقہ سے تو اور کمزوری ہو جائے گی۔ اب تو خون نہیں رس رہا ہے؟"

شاہد: جی نہیں، اب ٹھیک ہے۔"

حسینہ: وہ کون دوست تھا جس کی اسٹک تمہارے ماتھے میں لگ گئی؟"

شاہد: میرے ساتھ کالج میں پڑھتا ہے۔"

حسینہ: - نام کیا ہے اس کا

شاہد: - نام ———"

نوشابہ: - بتا کیوں نہیں دیتے، خالد بھائی ——— ہمیں معلوم ہے!"

شاہد: - (مسکرا کر) اچھا بھئی وہی سہی۔"

نوشابہ: - تو آپ نے کیوں نہیں مارا؟"

شاہد: - (ہنسی کے ساتھ) میں مار سکتا تھا بھلا انہیں؟"

نوشابہ: کیوں کیا آپ کمزور ہیں کچھ ان سے؟

شاہد: - کمزور تو نہیں ہوں ——— لیکن بات بڑھ جانے سے

کیا فائدہ ہے؟"

نوشابہ: "تم خود نہیں مارا تھا تو ابا جان سے پٹوا دیا ہوتا۔"

شاہد: "یہ بھی ٹھیک نہیں۔ ماموں جان کا غصہ بہت تیز ہے، یا مجھ پر خفا ہو جائیں گے یا خالد پر اور میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھ سے یا خالد سے خفا ہوں۔"

نوشابہ: "کیوں؟"

شاہد: "ممانی جان (حسینہ) کو صدمہ ہوگا۔"

نوشابہ: "انھیں تو اب صدمہ ہوا ہے آپ کی خاموشی سے۔ کیوں امی؟"

حسینہ: "ہاں بیٹے، مجھے بہت کوفت ہوئی آج، آخر خالد کی ہمت کیسے پڑی تم پر ہاتھ اٹھانے کی؟"

شاہد: "میری حیثیت ہی کیا ہے؟"

حسینہ: (دکھ بھری ہوئی آواز سے) "تم سے بڑھ کر کس کی حیثیت ہے اس گھر میں؟ کیا تم میرے جگر کے ٹکڑے نہیں ہو؟ جیسے تم ویسے خالد۔ لیکن تم زیادہ اس لئے ہو کہ خالد سے زیادہ سعادت مند ہو۔ ایسا خیال بھی اپنے دل میں نہ لانا کہ تمہاری حیثیت نہیں ہے۔ ورنہ مجھے بڑا دکھ ہوگا۔"

نوشابہ: "آخر بات کیا ہوئی تھی؟"

شاہد: "حضرت کو کچھ آتا جاتا تو ہے نہیں، مجھ سے سب کچھ غلط سلط بتا کر چلے گئے تھے، میں نے اس جہالت پر ٹوک دیا۔ بس بگڑ گئے۔"



حسینہ: "کچھ غلط تو کہا تھا ——— نالائق اور بدشوق بھی ہے وہ، پچھلے سال بھی نہیں ہوا، اس سال بھی دیکھ لینا فیل ہی ہوگا۔"

نوشابہ: (مسکراتے ہوئے) "یہی استارہ شاہد بھیا نے بھی کیا تھا جس پر خالہ جان ان کے منہ میں لوکا لگانے پر تیار ہوگئی تھیں۔"

شاہد: "وہ میری غلطی تھی، مجھے ان کے سامنے ایسی باتیں نہیں کہنا چاہیے تھا۔ جب سے اب تک ندامت ہو رہی ہے۔ جی چاہتا ہے معافی مانگ لوں جا کر۔"

حسینہ: "نہیں، کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں ہے، یہاں بیٹھو۔ بھئی نوشابہ، جا کھانا نکال لا، جا کر اپنے سامنے بٹھا کر کھلاؤں گی۔ دیکھوں کیسے نہیں کھاتا۔"

نوشابہ مسکراتی ہوئی اٹھی اور کھانا لینے چلی گئی۔ ذرا دیر میں مہری کے سر پر سینی رکھوائے واپس آئی۔ کھانا میز پر رکھ دیا گیا۔ حسینہ بیگم نے بڑے پیار سے کہا:

"دو چار لقمے کھا لے میرے بیٹے"

شاہد ہاتھ دھو کر کھانے بیٹھ گیا۔ نوشابہ نے کہا:

"آپ دال کیوں نہیں کھاتے ——— یہ دھلی ماش کی دال ہے۔"

حسینہ بیگم نے کہا۔

"رہنے دے بیٹے۔ بڑی آئی دال والی، بیٹے تو یہ قورمہ کھا،

دل دال رہنے دے!"

نوشابہ نے مچلتے ہوئے کہا:۔

"واہ! اتنے شوق سے تو پکائی ہے ہم نے ——— بیچ بڑے مزے کی!"

شاہد نے ایک بڑا سا لقمہ دال کا لیا اور کہا:۔

واقعی بھائی جان! دال بڑے مزے کی ہے، شاید آپ نے نہیں چکھا! ہے

وہ کہنے لگیں:۔

بیٹے میں ہمیشہ سے مریض ہوں! ماش کی دال ویسے ہی کھانے کی اجازت نہیں۔ پھر نوشابہ کی پکائی ہوئی ہے، نہ نمک ٹھیک ہے یا مرچ گلی الگ نہیں ہوگی، البتہ ہر کام میں ڈالے گی، لیکن جیسا کسی میں نہیں لگائے گی۔"

"نوشابہ نے بڑے ناز کے ساتھ کہا:"

"بھلا ———"

حسینہ کو ہنسی آگئی:

"تو جھوٹ کہتی ہوں کچھ؟"

وہ بولی:"

"تو کیا شاہد بھیا جھوٹے ہیں؟ آپ نے سنا نہیں کتنی تعریف کر رہے ہیں، لیجئے! وہ تو صاف ہی ہوگئی ——— ختم!"

حسینہ بیگم مسکرانے لگیں۔"



# خالد

یک سال اور گزر گیا:۔

دن بڑی اچھی طرح گزر رہے تھے۔ حسینہ بیگم کے رویہ میں ایسا عظیم الشان انقلاب آجائے گا، اس کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ نہ شاہد کو نہ نوشابہ کو! یہ دونوں اس تبدیلی پر بہت خوش تھے۔ مستقل طور پر نہیں، لیکن اکثر ہوتا کہ بھولا ہوا سبق یاد کرنے یا کوئی مشکل حل تلاش کرنے یا کوئی واقعہ دریافت کرنے کے لیے نوشابہ شاہد کے کمرے میں چلی جاتی یا اُسے اپنے کمرے میں بلا لیتی، رشیدہ بیگم یہ باتیں دیکھ کر کھول جاتیں۔ مگر دم نہ مارتیں خالد کی آنکھوں میں بھی خون اُتر آتا لیکن مجال کیا تھی کہ حسینہ بیگم یا نوشابہ یا ڈاکٹر صاحب سے کچھ کہہ سکتا۔ آسمان کو بجھا دیا اور

انہیں آمادہ کرتا کہ حسینہ بیگم کو سمجھائیں۔ وہ ارادہ کر کے جاتیں لیکن حسینہ کے تیور دیکھ کر چپ رہ جاتیں۔ دل کی دل میں رہتی۔ دل کی بات زبان تک لانے کا حوصلہ نہ پڑتا۔ کچھ اس لئے کہ بڑی بہن سے ذرا دبتی تھیں اور زیادہ تر اس لئے کہ کسی قیمت پر بھی حسینہ کو ناراض کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ کیونکہ پھر نوشابہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو جانا پڑتا۔ اور بھلا اتنے دولتمند باپ کی اکلوتی بیٹی سے محروم ہو جانا کیسے گوارہ کیا جا سکتا تھا۔ پھر یہ اطمینان بھی تھا کہ۔

چڑھی ہے یہ بلندی اتر جائے گی

شاہد پر لاکھ لطف و کرم کی بارش ہو مگر جو خالد ہے وہ شاہد کبھی نہیں ہو سکتا۔ شاہد کو بار بار سمجھایا کرتیں کہ کم از کم حسینہ کے سامنے ادب و لحاظ سے رہا کرے لیکن وہ ایک ملنگ آدمی تھا غصہ تو ناک پہ دھرا رہتا۔ اسے مارا، اسے پیٹا، اس پر چیخا، اس پر گرجا۔ اسے برا بھلا کہا، اس کی مرمت کر دی۔ ان حرکتوں سے حسینہ بیگم اور نالاں تھیں اور یہ ایسی حرکتیں تھیں جن کی صفائی رشیدہ کسی طرح نہیں دے سکتی تھی۔

ایک روز خالد ادھر نوشابہ کے کمرہ کی طرف ہوا وہاں شاہد بھی موجود تھا اور نہ معلوم کس بات پر دونوں خوب ہنس رہے تھے قہقہے کی آوازیں تھیں، مسکراہٹیں تھیں۔ بس جو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ جی چاہا ابھی جائے اور شاہد کا منہ نوچ لے۔ لیکن وہ تو ایک مضبوط قلعے میں بیٹھا تھا۔ یہاں بھلا کس طرح جاتا۔ غصہ میں لال پیلا سیدھا ماں کے پاس پہنچا اور کہا:۔



"خدا کی قسم چاقو بھونک دوں گا پیٹ میں۔"

چاقو کا نام سن کر رشیدہ چونک پڑی۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں بیٹے کو دیکھا اور پوچھا:۔

"کس کے پیٹ میں چاقو بھونکے گا لڑکے، کچھ دیوانہ ہوا ہے؟"

اس نے بپھرے ہوئے لہجہ میں جواب دیا:۔

"ہاں دیوانہ ہی سمجھ لو، لیکن جو کچھ کہہ رہا ہوں، کر کے رہوں گا۔"

رشیدہ کو بھی غصہ آگیا:۔

"آدمی بن ورنہ گلا گھونٹ دوں گی سمجھا کیا ہے ماں کو! اسی لئے تو آپا بھی نفرت کرنے لگی ہیں تجھ سے، بھلا کتنا چاہتی تھیں! اب صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں، بڑا آیا ہے طرم خاں بن کے۔"

خالد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ غصہ کی شدت نے بے بس کر دیا رونے لگا۔ کچھ دیر تک تو دل سخت کئے رشیدہ یہ منظر دیکھتی رہی، پھر اٹھی، دوپٹہ کے پلو سے اس کے آنسو پونچھے اور پیار بھرے لہجہ میں کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا:۔

"آخر ہوا کیا؟"

خالد نے ماں کا ہاتھ جھٹک اور روتے روتے کہا:۔

"جاؤ، دیکھ لو نوشابہ کے کمرے میں؛ ——— وہاں کیا گل کھل رہے ہیں!"

رشیدہ نے پریشان ہو کر پوچھا:۔

"ارے موئے! خدا کی خوار کیا ہو رہا ہے وہاں؟ ——— کچھ منہ سے پھوٹتا کیوں نہیں۔"

وہ بھرے ہوئے لہجہ میں بولا :-

"بس زبان نہ کھلواؤ، یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے اور جو آگے چل کر ہوگا، تمہاری ڈھیل کی وجہ سے ہے۔ ایک دفعہ اگر خالہ اماں سے سخت ہو کر بات کر لو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

رشیدہ نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا:

"وہ میری بڑی بہن ہے!"

خالد نے خفگی کے لہجہ میں جواب دیا:

"وہ بڑی بہن ہیں، تم چھوٹی بہن ہو، خالو جان غصہ ور بہت ہیں، نوشابہ لاڈلی بہت ہے۔ شاہد صاحب بھائی چہیتے بہت ہیں، تم سب میں ہر کوئی کچھ نہ کچھ ہے بس ایک میں کچھ نہیں ہوں۔"

رشیدہ بات کاٹ کر بولی

"کیوں نہیں ہے، میرا بیٹا ہے، میرا کلیجہ ہے، آپا بھی تجھے بہت چاہتی ہیں۔"

خالد نے روٹھے ہوئے انداز میں کہا:-

"مانتا ہوں، تم بھی بہت چاہتی ہو، خالہ بھی بہت چاہتی ہیں لیکن پھانسی کے تختہ سے مجھے کوئی نہیں بچا سکے گا، بلکہ تم دونوں کی وجہ سے پھانسی ہوگی مجھے!"

پھانسی! پھانسی کے تختہ کا نام سنکر رشیدہ تھر تھر کانپنے لگی۔

"یہ آج تو کیسی باتیں کر رہا ہے خالد؟"

خالد نے بے پروائی کے ساتھ کہا:-

"جیسی باتیں ایک زندگی سے بیزار آدمی کیا کرتا ہے!"

رشیدہ بولی:

"زندگی سے بیزار ہوں تیرے دشمن، تو کیوں بیزار ہونے لگا؟ تو نے ابھی دنیا میں دیکھا کیا ہے؟ ـــــــــ اب زمانہ آگیا ہے تیرے دنیا دیکھنے کا! ـــــــــ نہیں بتائے گا کیا بات ہوئی، دیکھ پھر مجھے رونا آجائے گا!"

یہ کہتے کہتے رشیدہ کی آواز بھرا گئی، خالد نے ماں کی اس کیفیت سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر جواب دیا:

"کہہ تو رہا ہوں اپنی آنکھوں سے دیکھ لو جا کر خود۔!"

رشیدہ نے دوپٹہ ٹھیک کیا اور نوشابہ کے کمرے کی طرف روانہ ہو گئیں۔

# شکوہ و شکایت

بالکل انجان اور بے پروائی رشیدہ ، نوشابہ کے کمرہ کی طرف سے گزری ۔ شاہد اب تک بیٹھا تھا ۔ دونوں میں گھل مل کر باتیں ہو رہی ہیں کسی بات پر دونوں ہنس رہے تھے ۔ رشیدہ نے بظاہر اس طرف توجہ بھی نہ کی ۔ سیدھی حسینہ کے کمرہ میں پہنچی ۔ وہ بھی کچھ سی رہی تھی ۔ رشیدہ کو دیکھ کر ردی کپڑے میں گھولنی کرانے کی طرف متوجہ ہوئیں ۔ بالکل تنہائی بھی ۔ گفتگو کے لئے اس سے اچھا موقعہ نہیں مل سکتا تھا ۔

رشیدہ نے کہا :

"آپا کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں تم سے !"

حسینہ نے کہا :

"تو کیا روکا ہے کہتیں کسی نے ؟"



رشیدہ : اس وقت میں نوشابہ کے کمرہ سے آ رہی ہوں !

حسینہ : ہاں ٹھیک ہے پھر ؟

رشیدہ : وہاں شاہد میاں براجمان ہیں !

حسینہ : تو میں کیا کروں ؟

رشیدہ : دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں ۔

حسینہ : خدا دونوں کو ہمیشہ اسی طرح خوش رکھے ، آخر کہنا کیا چاہتی ہو ؟

رشیدہ : مجھے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں

حسینہ : کون سی باتیں ؟

رشیدہ : یہی ہر وقت کا خلا ملا !

حسینہ : تو لگتی ہوں گی !

رشیدہ : سمجھ میں نہیں آتا ، تمہیں ہو کیا گیا ہے ، جب شاہد آج سے کئی برس پہلے آتا تھا تم نے اسے گوارہ نہ کیا کہ نوشابہ اس کے سامنے آئے ۔ جب نوشابہ آج سے کئی سال چھوٹی تھی تو تم نے اسے پسند نہ کیا کہ وہ شاہد سے بات چیت کرے مگر اب کہ دونوں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے ہیں ، تم اسے بھی برا نہیں سمجھتیں کہ دونوں ایک کمرے میں تنہا بیٹھ کر باتیں کریں ، قہقہے لگائیں ، چہلیں کریں ۔

حسینہ : بس یا کچھ اور بھی کہو گی ؟

رشیدہ : آپا ! یہ باتیں مجھ کو نہیں ، دوسرے دل کو بھی بری لگتی ہیں ۔

حسینہ : وہ دوسرے کون ہیں ؟

rekhta

رشیدہ: ایک تو خالد ہی ہے۔

حسینہ: خالد کو بھی برا لگتا ہے شاہد کا یہاں آنا جانا، اٹھنا بیٹھنا۔ نوشابہ سے ملنا جلنا۔"

رشیدہ: ہاں بہت زیادہ ــــــــــــ وہ تو آج اتنے غصہ میں تھا میں سہم گئی۔ اپنا بند بند کانپنے لگا۔"

حسینہ: کس بات پر غصہ تھا خالد میاں کو؟"

رشیدہ: ادھر سے گزرا تو شاہد کو بیٹھا دیکھا۔ ماشاء اللہ جوان لڑکا ہے۔ خون جوش میں آ گیا۔"

حسینہ: خون جوش میں آ گیا؟"

رشیدہ: ہاں آپا! وہ بہت غیرت مند ہے۔ کہہ رہا تھا ابھی جا کر سے پیٹ پھاڑ دوں گا اس کا!"

حسینہ: دیکھو بھائی رشیدہ بات وہ کہنی چاہیے جو بے عقلی کی نہ ہو!"

رشیدہ: تو آپا کیا میں نے کوئی بات بے تکی کی ہے؟

حسینہ: ہاں بالکل ــــــــــــ نوشابہ میری لڑکی ہے۔ اس کے لئے میں جتنی غیرت مند ہو سکتی ہوں کوئی نہیں ہو سکتا۔ شاہد میرے شوہر کا بھانجا ہے۔ اسے قریب سے اور دور سے میں نے دیکھا ہے۔ ایک عرصہ سے دیکھ رہی ہوں۔ میرا خیال ہے اس زمانہ میں اس جیسا لڑکا چراغ لے کر ڈھونڈو تو بھی نہ ملے گا۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھنا پابندی سے روزے رکھتا ہے۔ قرآن شریف کی تلاوت کرتا



ہے۔ امتحان میں ہر سال اول آتا ہے۔ اس کی قابلیت کی سب تعریف کرتے ہیں۔ نوکر بھی وہ اس کی شرافت کا گن گاتے ہیں۔ اپنے ہی وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، غیر ہیں۔ وہ اس کی بھلا بیان کرتے نہیں تھکتے ــــــــــــ تم کچھ کہو، لیکن شاہد کے خلاف کچھ نہ کہنا، ورنہ میری تمہاری لڑائی ہو جائے گی!"

رشیدہ: آپا! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟"

حسینہ: جو میں نے کہا۔"

رشیدہ: شاہد سب کچھ ہے خالد کچھ نہیں؟"

حسینہ: کیوں نہیں؟ جو محبت مجھے خالد سے ہو سکتی ہے شاہد سے نہیں۔ کئی مرتبہ سمجھایا لڑکا ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ خبر لو۔ سارے گھر میں اور مجھے جہاں تک معلوم ہے گھر سے باہر بھی کون ہے جو اس کی زبان سے، اس کے ہتھکنڈوں سے اس کی حرکتوں سے نالاں نہیں؟"

رشیدہ: وہی لوگ نالاں ہیں جو اس کے دشمن ہیں!

حسینہ: کیا مجھے بھی تم اس کا دشمن سمجھتی ہو؟"

رشیدہ: کیا تم اس سے نالاں ہو؟

حسینہ: ہاں بہت زیادہ!"

رشیدہ: کیوں بھلا؟"

حسینہ: اس لئے کہ وہ بدتمیز ہے، بیہودہ ہے، خیرہ چشم ہے۔ میرے سامنے شہزادی کے جوتے پکڑ کر اس نے گھسیٹے میرے سامنے خیراتی کی لڑکی کے گال میں چٹکی لی۔

اس کی آنکھوں میں ہر وقت شرارت اور بدی ناچتی۔ بیتی ہے۔ تمہارے
عباس صاحب یہاں بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں اور دوسرے کمرے
میں ٹھونڈو کو گالیاں دے رہا تھا، مار رہا تھا، انہوں نے مجھے
گھورا، کھانا چھوڑ دیا اور باہر اُٹھ کے چلے گئے۔ ان تک کا بھی لحاظ کرنا
اس لڑکے کو نہیں آتا۔ اتنا شرمندہ ہوئی ہوں میں کہ بس کچھ نہ پوچھو!

رشیدہ: اور شاہد؟"

حسینہ: اس کی کوئی بات اس طرح کی اگر ثابت ہو جائے تو
گھر سے کھڑے نکال دوں ——— بس یہی فرق ہے
شاہد میں اور خالد میں۔ شاہد اگر بگڑ جائے تو ایک منٹ
اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ خالد بگڑا ہے۔ اور میں اس سے کچھ
نہیں کہہ سکتی۔ کیا یہ معمولی فرق ہے؟ کیا تم اسے کافی
نہیں سمجھتی ہو؟"

رشیدہ: یہ الگ بات ہے مگر ———"

حسینہ: مگر کیا؟

رشیدہ: مگر شاہد کا نوشابہ کے پاس اٹھنا بیٹھنا ایک آنکھ
مجھے نہیں بھاتا۔"

حسینہ: نہ بھاتا ہوگا! ——— پھر ایک فرق شاہد اور خالد
کا معلوم کر لو۔ خالد کو نوشابہ کے کمرہ میں اکیلا بیٹھنے کی اجازت
نہیں دے سکتی۔ شاہد پر کوئی اعتراض نہیں کرتی ——— یہ فرق
بھی بہت بڑا اور اہم فرق ہے۔
مجھ سے نہ پوچھو۔ خود ہی سوچو، غور کرو کہ ایسا کیوں ہے؟"

---



# گھر کے اندر اور گھر کے باہر

دن گزرتے چلے جا رہے ہیں!

خالد الیف۔ اے کا طالب علم اور شاہد بی۔ اے کے آخری
سال کا طالب علم ہے۔ نوشابہ بھی اس سال الیف۔ اے کے امتحان م
کامیاب ہو گئی۔ اسے میں بہت خوشی ہے۔"

خالد حسینہ کے لئے ایک مستقل دردِ سر بن چکا ہے۔ کبھی
آدمی بن جاتا ہے، کبھی شیطان، کبھی باادب، کبھی بدتمیز۔ حسینہ کا
طرزِ عمل بھی ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ آدمی بن جاتا
ہے تو خوش ہو جاتی ہیں۔ شیطان بنتا ہے تو نفرت کرنے لگتی ہیں۔
باادب نظر آتا ہے تو محبت ابھرنے لگتی ہے دل میں۔ بدتمیزی ک
دیکھتی ہیں تو جھڑک دیتی ہیں، ڈانٹ دیتی ہیں، خفا ہو جاتی ہیں
لیکن یہ سب باتیں اندرونِ خانہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے کان تک خ

کی نالائقی کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی۔ ان کا خیال تھا اور بجا خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی رائے خراب ہو گئی تو آخری دن ہوگا اس گھر میں خالد کے قیام کا اور اسے وہ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی تھیں کہ بات یہاں تک پہنچے۔ نوبت یہاں تک آئے۔"

خالد اور شاہد کے تعلقات میں بھی یکسانیت نہیں تھی۔ شاہد نے کبھی اس سے دشمنی کا اظہار نہیں کیا، اس کی مخالفت نہیں کی، شکایت نہیں کی، اس کے لئے سخت الفاظ استعمال نہیں کئے، خالد یہ سب کچھ کرتا تھا۔ پھر بھی اگر کوئی بات آپڑتی تو شاہد، خالد کا ساتھ دیتا تھا۔ کالج کے ایک ہنگامہ کے سلسلے میں پرنسپل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ خالد کو نکال دے گا۔ لیکن شاہد کی گواہی نے پانسہ پلٹ دیا اور وہ اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو گئے۔ شاہد نے اپنے اس کارنامہ کا خالد سے ذکر بھی نہیں کیا۔ وہ تو نیکی کر کنویں میں ڈال کا قائل تھا۔

چند روز کے بعد جب خالد نے موقع پا کر پرنسپل سے بعض لڑکوں کی شکایت کی تو شاہد کا نام بھی شامل کر لیا اور جتنی برائیاں ممکن ہو سکتی تھیں کر ڈالیں۔ پرنسپل شریف آدمی تھا۔ مسکرا مسکرا کر ان حضرت کی باتیں سنتا رہا۔ جب فرما چکے تو کہا:

"کتنے شرم کی بات ہے کہ تم اس کی برائیاں کر رہے ہو جس کے سب گن گاتے ہیں، تم اپنے محسن کی شکایت کر رہے ہو؟"

خالد کی خودداری عود کر آئی۔ بھلا شاہد اور اس کا محسن! اس نے ادب اور تہذیب کو بالائے طاق رکھ کر کہا:

"شاہد کا احسان قبول کرنے کے مقابلے میں مرجانا میرے لئے



آسان ہے اور اپنی فطرت کے اعتبار سے اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ کسی پر احسان کر سکے۔"

پرنسپل صاحب نے فرمایا:

"خالد! تم غلط کہتے ہو ——— تم نے دونوں باتیں غلط کہی ہیں۔ شاہد کی فطرت اگر خراب ہوتی تو تم پر احسان نہ کرتا۔"

خالد نے احتجاج کرتے ہوئے کہا:

"اس نے کبھی مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا ہے!"

پرنسپل نے ٹوکا:

"کیا ہے ——— تمہاری ہنگامہ آرائیوں کے باعث میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کالج سے نکال دوں گا! لیکن شاہد میرے پاس آیا۔ اس نے گواہی دی، جو تمہارے موافق تھی۔ تم میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس نے خوبیاں بیان کیں، اور مجھے قائل کر دیا۔ مجھے مجبور کر دیا کہ اپنا فیصلہ واپس لے لوں اور آخر میں نے یہی کیا۔"

خالد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پرنسپل نے پوچھا۔

"کیا اس واقعہ کا ذکر تم سے شاہد نے نہیں کیا تھا؟"

خالد نے جواب دیا:

"جی نہیں!"

پرنسپل نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا:

"بہت اچھا کیا ورنہ شاید تم خودکشی کر لیتے ———

ابھی تم نے کہا تھا کہ اس کا احسان قبول کرنے کے مقابلہ میں

مرجانا پسند ہے"۔

خالد پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ چپ چاپ لوٹ آیا۔

گھر میں نوشابہ کا جہاں تک تعلق تھا۔ خالد اور شاہد، دونوں ہی کے ساتھ اس کا برتاؤ اچھا تھا۔ ایک باپ کا لاڈلا بچہ تھا، دوسرا ماں کا چہیتا بچہ تھا۔ باپ بھی محبوب تھا، ماں بھی۔ لیکن بظاہر اس کا رویہ شاہد کے ساتھ زیادہ اچھا تھا، اس لیے کہ خالد صاحب وقتاً فوقتاً اس سے بھی اکڑ جایا کرتا تھا کبھی بگڑ جاتے، کبھی اینٹھ جاتے، کبھی اول فول بکنے لگتے۔ شاہد کو ایسی باتوں سے بھلا کیا سروکار، وہ ہمیشہ مسکرا کر بات کرتا اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ اس کا کوئی کام ہوتا تو اپنا کام حرج کر کے کر دیتا۔ اسکی نگاہیں بیجا نہ تھا اور کوئی ایسی بات نہ کرتا جو اس کی ناگواری کا سبب ہو۔ ان باتوں کا قدرتی نتیجہ یہی تھا کہ وہ شاہد سے جتنی مانوس تھی خالد سے نہ تھی۔

ہم سے کیا ضد تھی اگر تم کسی قابل ہوتے؛

خالد صاحب اینٹھ جاتے تو وہ بات بھی نہ پوچھتی، بگڑ جاتے تو ایک کی دس سناتی۔ خفا ہوتے تو ان سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتی اور جب یہ طوفان گزر جاتا اور وہ آدمیت کے جامہ میں آ جاتے تو نوشابہ بھی خلوص اور محبت کے ساتھ ملنے لگتی ان کی بات کا جواب دیتی ان کا کام کر دیتی۔ ان سے باتوں کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر شروع کر دیتی۔ رہا بیچارہ شاہد، تو وہ نہ اینٹھنا جانتا تھا، نہ روٹھنا۔ اسے اپنے کام سے کام تھا۔ اس کی پالیسی یہی تھی کہ کسی معاملے میں دخل نہ دے اور اگر کسی کا کام آ پڑے تو ضرور کر دے۔ گھر کے نوکروں تک کے کام آتا اور ان کی بگڑی بناتا اس کا بہترین فریضہ تھا اور اس فریضہ کو بڑی خوبی کے ساتھ وہ انجام دیتا تھا



# رفو

نوشابہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی، رشیدہ اور حسینہ بھی وہیں موجود تھیں۔ شاہد اکنامکس کا سبق دے رہا تھا، وہ بڑی توجہ سے ضروری ضروری نوٹ لیتی جا رہی تھی سبق سے فارغ ہونے کے بعد شاہد نے کہا۔

"نوشابہ ہمارا ایک کام کر دوگی؟"

وہ آمادگی اور مستعدی کے ساتھ بولی:

"ضرور کر دوں گی، بتائیے!"

شاہد: آج کالج میں ایک پارٹی ہے۔ میرا گرم کوٹ، کیڑوں کو بہت پسند آیا! اتفاق سے سینہ کے پاس ذرا سا سوراخ نظر آ رہا ہے۔ اسے رفو کر دو۔ سنا ہے، رفو بہت اچھا کر لیتی ہو؛ لیکن ایسا ہو کہ پتہ نہ چلے۔"

نوشابہ:- کوشش تو یہی ہوگی ـــــــ کب تک چاہیے

آپ کو؟

شاہد:- شام کو چار بجے پارٹی میں جانا ہے۔ اس وقت تک اگر تیار ہو جائے، تو کیا کہنا!"

نوشابہ: اور اگر اس وقت تک نہ تیار ہو سکے تو؟

شاہد:- تو مجھے بھی ______ نہیں جائیں گے پارٹی میں!"

نوشابہ: نہیں نہیں! آپ ضرور جائیں گے، انشاء اللہ تیار ہو جائے گا،

یہ کہہ کر نوشابہ نے الٹ پلٹ کر کوٹ کا جائزہ لیا اور کتابیں میز پر رکھ کر رفو کرنے بیٹھ گئی۔ شاہد تو کوٹ دے کر جا ہی چکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد رشیدہ بھی اٹھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد نوشابہ نے ماں سے کہا:"

امی! اس کوٹ میں تو کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ کئی جگہ سے کپڑا دینے جا رہا ہے۔ کہاں کہاں رفو کروں گی بیٹھ کر؟ اور یہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ اسے پہن کر پارٹی میں شرکت کی جائے!"

حسینہ نے جواب دیا:"

اس لڑکے کی بے زبانی نے تو مجھے پریشان کر دیا ہے! کیا مجال منہ سے بولے، میرے مجھلے بچے جب تک نہیں روتا، ماں دودھ نہیں دیتی۔ یہ حضرت کچھ کہیں گے نہیں تو کیسے جانوں گی انھیں کیا ضرورت ہے اور کیا نہیں؟

نوشابہ:- ہاں! یہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں، لیکن ان کی عادت ہی یہی ہے، کیا کیا جائے!

حسینہ: یہی تو رونا ہے!"



نوشابہ:- پھر اب کیا ہوگا؟"

حسینہ: کیا بتاؤں بیٹی ______ جاؤں رشیدہ سے کہہ کر خالد کا کوٹ کوئی مانگ لاؤں ذرا دیر کے لیے؟"

نوشابہ: نہیں امی! ایسا نہ کیجئے۔ نہ خالد بھائی اتنے عالی ظرف ہیں کہ کوٹ دے دیں گے، نہ شاہد بھیا اتنے بے غیرت ہیں کہ ان کا کوٹ پہن لیں گے!"

حسینہ: پھر کیا کیا جائے؟ کوئی تدبیر بھی تو بتاؤ یا خواہ مخواہ میرا دل جلاتی رہو گی ______ ؟

نوشابہ: تدبیر ہے امی!"

حسینہ: (مسکرا کر) ہو تو امی کو بھی بتائی کیوں نہیں؟

نوشابہ:- دو سو روپے دیجئے تو بتاؤں گی!"

حسینہ: تیرے ایک اشارہ پر دو ہزار قربان کر دوں گی۔ لیکن کرے گی کیا؟ کچھ معلوم بھی تو ہو؟"

نوشابہ:- شاہد بھیا کے لئے ایک نیا سوٹ لاؤں گی، وول ہاؤس سے!"

حسینہ:- بھلا سلا یا مل جائے گا؟

نوشابہ: کیوں نہیں ملے گا؟

حسینہ: روپے شاہد کو کیوں نہ دے دوں، وہ تو خود اپنی پسند کا لے آئے گا؟"

نوشابہ:- بچوں کی طرح مچل کر نہیں امی!"

حسینہ:- یہ کیوں، مجھے کیا تو نہ جانے کیسا اٹھا لائے؟"

نوشابہ: بڑا عمدہ لاؤں گی، پسند کرتے ہی سب کی آنکھیں دیکھیے گا

حسینہ: (الجھتے ہوئے) لب آگئی تو ——— اب

بھلا کس کی سننے لگیں تم؟"

نوشابہ: (مسکرا کر) آپ جانتی تو ہیں، پھر دیر کیوں کر رہی ہیں؟

حسینہ اٹھ کر اپنے کمرے میں گئی اور دو سو روپے لا کر نوشابہ کے ہاتھ میں رکھ دیے۔ وہ خوش ہو گئی۔ کہنے لگی:

امی تماشا دیکھیے گا ابھی نہ بتایئے گا۔"

وہ مسکرانے لگیں۔

نہیں بتاؤں گی:

نوشابہ نے جلدی جلدی کپڑے بدلے، اور یہ اطمینان کر کے کہ ڈاکٹر صاحب اس وقت کہیں نہیں جائیں گے، جمیلہ سے کہہ کر گیرج سے کار نکلوائی اور بازار چلی گئی۔"

کئی دوکانوں پر چکر کاٹنے کے بعد ایک سوٹ بہت زیادہ پسند آیا۔ پورے سوٹ کی قیمت دو سو پانچ روپے تھی، اس نے پرس سے روپے نکالے اور گن دیئے۔ دوکاندار نے سوٹ پیک کر کے سامنے رکھ دیا۔ وہ موٹر میں آ کر بیٹھ گئی، اور گھر روانہ ہو گئی۔"

نوشابہ کی عادت نہ ادھر ادھر دیکھنے کی تھی، نہ ٹوہ لگانے کی۔ اسے اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ دو غضبناک آنکھیں اسے گھور رہی ہیں، اس کا تعاقب کر رہی ہیں

یہ آنکھیں ناہید کی تھیں ۔۔۔!

وہ بھی اسی بال میں شرکت کے لئے اپنا سوٹ یہاں لینے آیا

تھا۔ جو آج سے پندرہ دن پہلے خاص آرڈر پر تیار کیا گیا تھا۔"

جس کے کپڑے اور سلائی کی قیمت ساڑھے چار سو روپے اس نے ادا کی تھی۔"

# بچہ!

نوشابہ ابھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ شاہد آ گیا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائی
کھڑی ہو گئی اور ایک روح پرور تبسم کے ساتھ کہا:۔
"آئیے!"
شاہد سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا:
"کہئے جناب، ہمارا کام کر دیا آپ نے؟"
نوشابہ نے بڑی سادگی کے ساتھ پوچھا:
"کون سا کام؟"
"پھر تو ذہن سے نکل گیا!"
"شاید آپ کرتے کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟
لیکن وہ تو اس قابل ہی نہیں کہ رفو کیا جا سکے۔ میں نے بہت کوشش



یہ سن کر شاہد اداس سا ہو گیا۔ اس نے مضمحل لہجے میں کہا:۔
"اندیشہ تو مجھے بھی یہی تھا کہ مرمت نہ ہو سکے گی۔
خیر لاؤ، اسی سے کام چلا لوں گا!"
نوشابہ:۔ "تو کیا آپ وہی پہن کر جائیں گے؟"
شاہد:۔ "پھر اور کیا کروں گا؟"
نوشابہ: "وہاں جانے کیسے کیسے زرق برق لباس میں لوگ جمع ہوں گے
اور آپ اس لباس میں جائیں گے۔ مجھے تو یہ اچھا نہیں لگتا!"
شاہد: "تو اس میں حرج کیا ہے۔ آدمی کی وقعت لباس سے
نہیں ہوتی۔"
نوشابہ: "پھر کاہے سے ہوتی ہے؟"
شاہد:۔ "حسن سے، اعتماد سے، اخلاق سے، شرافت سے!"
نوشابہ۔ "ہاں یہ تو ٹھیک ہے، لیکن لباس بھی بڑی چیز ہے!"
شاہد:۔ (مسکراتے ہوئے) "عورتوں کے لئے!"
نوشابہ:۔ "اس میں مرد اور عورتوں کی تفریق کیسی؟"
شاہد: "لباس اہمیت عورتوں کی نگاہ میں زیادہ ہوتی ہے۔
ہونی بھی چاہئے، لیکن مردوں کو زیب و زینت سے کیا سروکار؟
وہ اگر اس میں الجھے تو اپنی ذمہ داری پوری کر چکے۔"
نوشابہ:۔ "تو خالد بھائی کے بارے میں یہ خیالات ہیں آپ کے؟"
شاہد:۔ "خالد کے بارے میں تو میں نے کچھ نہیں کہا!"
نوشابہ:۔ "کیسے نہیں کہا، آپ انہی پر تو چوٹ کر رہے ہیں۔
وہ فیشن کرتے ہیں، ہر وقت بنے ٹھنے رہتے ہیں۔ کہیں

دامن کی کریز نہ ٹوٹ جائے کہیں کوٹ میں شکن نہ رہ جائے۔ کہیں ٹائی کا رنگ پھیکا نہ پڑ جائے۔ گو یا یہ فیشن مردوں کے نہیں، عورتوں کے ہیں۔ اس لحاظ سے خالد بھائی کیا ہوئے، مرد یا عورت؟"

شاہد ہنسنے لگا۔ اس نے کہا:

"خالد کا ذکر نہ کرو۔ اس کے لئے سب جائز ہے۔"

نوشابہ نے تیوری چڑھا کر پوچھا:

"کیوں جائز ہے؟"

شاہد: "اس لئے کہ وہ ایک بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ ایک دولتمند گھرانے کا فرد ہے۔ وہ ہر فرمائش پوری کر سکتا ہے۔ اس کی کوئی فرمائش رد نہیں کی جا سکتی۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے"

نوشابہ: "اور آپ؟"

شاہد: "میں ــــ میرا کیا ذکر ــــــ

صورت یہ ہے حالِ مرا پس ــــــ نہ باپ نہ ماں نہ گھر نہ در، نہ دولت نہ ثروت۔ نہ دوست نہ آشنا، میری زندگی کیا ہے؟ ایک بے آب و گیاہ میدان، نہ کوئی سایہ دار درخت ہے نہ پر بہار چمن ہے! ہاں قدم قدم پر کانٹے ضرور ہیں۔ ساتھ چلنے اور دامن بچانے کو موجود۔ بہرحال خدا کا شکر ہے ــــ کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں!

یہ باتیں بڑے تاثر کے عالم میں شاہد اپنی رو میں کہتا چلا گیا تھا۔ نظر اٹھائی تو دیکھا! نوشابہ کا رنگ رُخ متغیر ہے۔ اس نے پریشان لہجہ میں پوچھا:



"کیا سوچ رہی ہو نوشابہ؟"

نوشابہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کی صورت میں دو بڑے بڑے موتی گر پڑے۔ شاہد اور گھبرا گیا۔ اس نے کہا:

"کیا ہوا نوشابہ؟"

اتنی دیر میں نوشابہ اپنے آنسو پونچھ چکی تھی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا:

"کچھ نہیں!"

شاہد نے بےکلی کے ساتھ کہا:

"نہیں کوئی بات ضرور ہے۔ شاید میرے منہ سے کوئی ایسی بات نکل گئی ہے جو تمہارے لئے تکلیف دہ ثابت ہوئی میں نہیں جانتا، وہ کونسی بات ہے لیکن تم سے توقع رکھتا ہوں کہ میری معذرت قبول کر لو گی۔"

نوشابہ بولی:

"نہیں ایسی تو کوئی نہ تھی۔ جس پر آپ کو اتنی لمبی چوڑی تقریر کرنے کی ضرورت پڑتی! البتہ یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ ہم لوگ آپ کی نظر میں غیر کے غیر رہیں گے۔"

شاہد اور زیادہ بوکھلا گیا:

"یہ کیا کہہ رہی ہو نوشابہ ــــ"

وہ بولی:

"کچھ غلط تو نہیں کہتی؟"

شاہد: بالکل غلط! کیا آج میں زندہ ہوتا اگر ممانی جان نے اپنی

آغوشِ شفقت وا نہ کر دی ہوتی، یقین کرو اماں کے انتقال کے وقت اور ان کے انتقال کے بعد کئی دفعہ میرا جی چاہا کہ خودکشی کر لوں، لیکن وہ صرف بھائی جان کا سلوک اور تمہارا ایثار تھا، جس نے مجھے زندہ رہنے پر مجبور کیا، جس نے مجھ میں زندہ رہنے کی امنگ پیدا کی۔"

نوشابہ:۔ "پھر بھی یہ زندگی آپ کے لئے بے آب و گیاہ میدان ہے جس میں نہ کوئی سایہ دار درخت ہے، نہ پُربہار چمن ۔۔۔ ذرا سوچئے تو کتنی سخت بات کہہ گئے تھے آپ؟"

شاہد:۔ "واقعی بڑی حماقت ہوگئی۔ نہ جانے یہ الفاظ کس طرح میرے منہ سے نکل گئے؟"

اس اقرارِ حماقت پر نوشابہ کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ وہ بولی:۔

"کیا آپ پارٹی میں نہیں جائیں گے؟"

"چار تو بج رہے ہیں؟"

شاہد نے کہا:۔

"اب کیا کروں گا جا کر؟"

نوشابہ ضد کرتے ہوئے بولی:

"نہیں جانا پڑے گا آپ کو!"

شاہد راضی ہوگیا:

"اچھا چلا جاؤں گا، لیکن وہ کوٹ تو واپس کر دو میرا؟"

نوشابہ نے کہا:

"نہیں وہ کوٹ پہن کر آپ نہیں جائیں گے!"

شاہد مسکرایا۔

"اچھا تو یونہی چلا جاؤں گا۔"

وہ بولی۔

"نہیں یوں بھی نہیں!"

یہ کہہ کر وہ ابھی ابھی اپنا خریدا ہوا سوٹ سامنے لاکر رکھ دیا۔

"ذرا اسے پہن کر تو دیکھئے فٹ ہے یا نہیں؟"

شاہد نے حیرت سے سوٹ کو دیکھا، پھر نوشابہ سے کہا:۔

"یہ سوٹ ۔۔۔"

نوشابہ بولی:۔

"جی ہاں یہی ۔۔۔ ذرا پہن کر تو دکھائیے!"

شاہد سوٹ لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ذرا دیر میں پارٹی کی شرکت کے لئے تیار ہو کر آگیا۔ نوشابہ خوش ہوگئی۔ جیسے کلی کھل جاتی ہے۔ جیسے پھول شگفتہ ہو جاتا ہے۔ وہ خوشی کا جھولا جھولتی ہوئی گویا ہوئی:

"یہاں آئیے ۔۔۔ ادھر!"

سامنے قدِ آدم آئینہ موجود تھا۔ نوشابہ نے شاہد کے عکس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"دیکھئے کتنا اچھا لگ رہا ہے! جیسے آپ ہی کے لئے سِیا گیا ہے۔ میرے اندازہ کی داد دیجئے، کہیں بھی تو جھول نہیں ہے!"

اتنے میں حسینہ بیگم آگئیں۔ انہیں دیکھ کر شاہد حواس باختہ ہوگیا۔ اس نے بڑی تلخی کے ساتھ کہا:

دیکھئے یہ موٹ ـــــ"

حسینہ بیگم نے بات پوری کر دی:

"جیتا رہے، خدا تجھے ہنسنا نصیب کرے!"

شاہد نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو ان کی آنکھوں سے محبت اُبل رہی تھی وہ تاب نہ لا سکا اس کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں۔ حسینہ نے بڑھ کر اس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"میرا بچہ!"

نوشابہ نے مسکراتے ہوئے کہا:

"پہلے انہیں پارٹی سے ہو آنے دیجئے، پھر اطمینان سے دلار کرتی رہیئے گا!"

وہ بولیں:

"تو کیوں جلتی ہے؟"

وہ ہنسنے لگی۔

حسینہ نے شاہد سے کہا:

"جس دن مجھے یہ یقین آ جائے گا کہ تو واقعی مجھے اپنی ماں سمجھتا ہے اس دن ـــــ"

نوشابہ بیچ میں بول پڑی:

"عید ہو جائے گی ـــــ"

"کیوں امی؟"

حسینہ بیگم ہنسنے لگیں:

"شریر کہیں کی!"



شاہد نے کہا:۔

"آپ کے سوا اس دنیا میں میرا اور کون ہے۔ میری ماں بھی آپ ہیں اور باپ بھی آپ ہیں ـــــ ماں کی محبت اور باپ کی شفقت، یہ دونوں نعمتیں آپ کی ذات سے مجھے ملی ہیں!"

نوشابہ نے چھیڑا:

"لیکن ماں باپ سے تکلف تو نہیں کیا جاتا، مجھے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے یا جس بات کا جی چاہتا ہے، بے تامل امی ابا سے کہہ دیتی ہوں، بلکہ ضد کر کے اپنی بات منواتی ہوں۔ کیا آپ بھی ایسا کرتے ہیں؟"

شاہد نے جواب دیا:

"ضد بچے کرتے ہیں، میں بچہ تو نہیں ہوں!"

حسینہ بیگم نے لقمہ دیا:

"کیا میری نظر میں بھی نہیں؟"

شاہد اور نوشابہ کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا۔

# طمانچہ

پروفیسر رضوی کالج کے محبوب اساتذہ میں شمار ہوتے تھے
ج کی پارٹی انہی کے اعزاز میں دی گئی تھی۔ ان کا تبادلہ ہو گیا تھا۔
سعادتمند شاگردوں نے چاہا تھا کہ شان و شوکت کے ساتھ استاد
و رخصت کیا جائے۔ پارٹی بہت کامیاب رہی، تمام طلبا اور
ساتذہ موجود تھے۔ اساتذہ کی طرف سے پرنسپل نے اور طلبا
ی طرف سے شاہد نے تقریر کی۔ شاہد کی تقریر نے جادو کا
ام کیا۔ ایسی شستہ شائستہ اور سحر آگیں تقریر کسی کی نہیں ہوئی
وں تو تمام اساتذہ تحسین و تعریف کی نظر سے اسے دیکھ رہے تھے
لیکن پروفیسر رضوی سے ضبط نہ ہو سکا۔ انہوں نے بے ساختہ
ٹھ کر اس کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا:

"مجھے فخر ہے کہ تم میرے شاگرد ہو!"



جلسے کے بعد لوگ مختلف میزوں پر منتشر ہو گئے۔ طلبہ کا مجمع ایک طرف تھا، اساتذہ کا دوسری طرف۔ طلبہ کی مختلف پارٹیاں الگ الگ میزوں پر دلچسپ اور پُرتکلف باتوں میں مصروف تھیں، شاہد جس میز پر بیٹھا تھا وہیں ارشاد، زاہد، اخلاق، اور پرویز بھی تھے، یہ سب آپس میں گہرے دوست تھے۔ ارشاد نے شاہد کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا:

"شاباش تم نے میرا نام روشن کر دیا، جیو، خوش رہو۔"

سب لوگ اس ایکٹنگ پر بے تحاشہ ہنس پڑے۔ اخلاق نے کہا:

"کیوں ہنس رہے ہو بے چارے شاہد پر ۔۔۔۔ اچھا مان لیا، بس نے تقریر اچھی کی تھی لیکن اس کی داد تو دو کتنی خوبی سے رٹی تھی یہ معلوم ہوتا تھا پارلیمنٹ کے ۔۔ ایوان میں کوئی تقریر کر رہا ہے رٹنا بھی ایک فن ہے۔ کیوں میاں شاہد اگر بھول جاتے کوئی جملہ تو کیا ہوتا؟"

شاہد نے جواب دیا:

"ہوتا کیا، تو "تمہیں پکارتا ۔۔۔۔۔۔ کہ جس نے درد دیا ہے، تمہی دوا دینا ۔۔۔!"

پھر سب لوگ بے تحاشہ ہنسنے لگے۔ زاہد نے کہا:

"یار شاہد! ویسے تو تم بالکل بھیگی بلی معلوم ہوتے ہو، بڑے بھولے، بڑے معصوم، جیسے کچھ جانتے ہی نہیں اور تقریر کرنے ہو تو معلوم ہوتا ہے کچھار میں شیر دھاڑ رہا ہے۔"

پرویز نے ٹوکا:

"یہی تو بزرگوں کا قول ہے، گربہ کشتن روزِ اول"

اخلاق نے کہا:

"بالکل سمجھ میں نہیں آیا تمہارا مقصد کیا ہے؟"

پرویز نے جواب دیا:

"مقصد بالکل واضح ہے۔ یہ شاہد صاحب جتنی بلی بقول آپ کے معلوم ہوتے ہیں، لہٰذا ہم سب کو چاہیئے کہ انہیں پیٹ دیں اس لئے کہ آج پہلا دن ہے کہ انہوں نے اپنا یہ جوہر اس آب و تاب سے دکھایا ہے، ورنہ پھر شیر بن جائیں گے اور کالج بیچارا اور ہم سب لقمۂ تر!"

پھر سب ہنسنے لگے۔

اتنے میں گھومتا گھامتا خالد ادھر آگیا۔ اخلاق نے اسے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور کہا:

"ڈوب مرو چلو بھر پانی میں!"

پرویز بیچ میں بول پڑا:

"نہیں اتنی جلدی کیا ہے، اگلے سال سہی ــــــــــ"

پھر ایک قہقہہ پرزور بلند ہوا۔

خالد نے پوچھا:

"آخر تم لوگ بگڑ کیوں رہے ہو؟"

ارشاد نے کہا:

"شکر کرو بچ گئے ہیں اگر شاہد کے بدلے تم نے تقریر کی ہوتی تو رو رہے ہوتے!"

خالد نے اکڑ کر کہا:

"مجھے خوشامد کرنا نہیں آتی!"

زاہد بول پڑا:

"بہت اچھے! گویا شاہد نے خوشامد کی تھی۔"

خالد: "اور کیا؟"

زاہد: کیوں بھئی شاہد خوشامد کی تھی تم نے؟

شاہد: اپنے بارے میں کوئی شخص بھی صحیح رائے نہیں قائم کرسکتا یہ دوسروں کا حق ہے کہ وہ اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں!"

پرویز: چھوڑو، یہ کہاں کی باتیں چھیڑ دیں تم لوگوں نے۔ ہاں شاہد! یہ تو بتاؤ، انٹر کالج ڈیبیٹ میں شرکت کرنے کب جا رہے ہو۔ ہمارے کالج سے تمہارا ہی انتخاب تو ہوا ہے۔"

شاہد: سنا تو یہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھا جائے گا!"

پرویز: تمہیں چاہیے خالد کے حق میں دستبردار ہو جاؤ۔ اسے بھی موقع ملنا چاہیئے۔"

شاہد: بسروچشم ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے، بلکہ خالد اگر جائیں تو مجھے خوشی ہوگی!"

خالد: شکریہ! لیکن بھیک مانگے کسی کو کیا خیرات دیں گے؛ میرے لئے اس سے بڑھ کر ننگ کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ شاہد صاحب کی بجائے میرا انتخاب ہو۔"

پرویز: تم تو خواہ مخواہ جلتے ہو شاہد سے!"

خالد: مجھے کیا پڑی ہے کہ کسی سے جلوں، نہ ہی شاہد کی طرح خیرات کا کھاتا ہوں، نہ مانگے کے کپڑے پہنتا ہوں۔

اخلاق: کیا مطلب، کیا یہ بڑھیا سوٹ کہیں سے مانگ کر لائے ہو؟ کیوں شاہد؟

خالد: ایسے چبھتے ہوئے سوالات نہ کرو، دیکھتے نہیں چہرے پہ شرم کی سرخی دوڑ گئی۔

ارشاد: ہو سکتا ہے کہ یہ سرخی غصہ کی ہو۔

خالد: (طنز کے ساتھ) غصہ؟ ........ نہیں، شاہد جیسے لوگوں کو غصہ نہیں آ سکتا۔ غصہ انہی کو آتا ہے جو غیرت مند ہوں، جو عورتوں اور لڑکیوں کے ٹکڑوں پر پل رہے ہوں، انہیں قدرت کی طرف سے غصہ نہیں ملتا، شرم ملتی ہے۔

پرویز: یہ لڑکیوں اور عورتوں کا کیا قصہ چل پڑا......؟ عجیب داستان طلسم ہوشربا شروع کر دی تم نے؟

خالد: (ہنستے ہوئے) ہاں بھئی! یہ ایک راز ہے۔

ارشاد: یاروں سے بھی راز؟

خالد: ہاں، ایک پردہ نشین کا راز۔

پرویز: پردہ نشین؟

خالد: ہاں، پردہ نشین کا راز، رنگ رلیوں کی داستان، نگاہوں کی باتیں، محبت کی گھاتیں۔

شاہد کا غصہ اب ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا



اس نے زور سے کہا "خالد......!"

خالد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "چیخ کر نہ بولو۔ میں بہرہ نہیں ہوں۔ ہاں بھئی پرویز! تو سنو گے یہ رومان؟"

پرویز: ضرور، ضرور............ مگر اس پری وش کا اور پھر بیان تیرا، جلد شروع کرو۔

خالد: اچھا تو شروع ہوتی ہے داستان۔
"آنکھوں دیکھی کہتے ہیں، کانوں سنی نہیں کہتے۔"

سب لوگ ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گئے، لیکن قبل اس کے کہ خالد کی زبان سے کچھ نکلے، شاہد کا ایک بھرپور طمانچہ خالد کے منہ پڑا۔ وہ بیچ کرسی کے لڑھک کر زمین پر آ رہا۔ سب لوگ اس کی طرف لپکے اور شاہد نکلا چلا گیا۔

—————

گے گویے کی طرح دندناتے ہوئے اُٹھے اور سیدھے اپنے فلک نما میں پہنچے۔ یہ طے کر کے بیٹھے تھے کہ آج شاہد کی خیر نہیں۔ پستول کی ایک گولی اس کا خاتمہ کر دے گی۔ وہ خاک و خون میں تڑپنے لگے گا اور پھر خلق خدا خالد کی بہادری اور شجاعت کی داد دے گی کہ ہاں تھی عقبہ ہو تو ایسا ہو کہ خالد میاں کے پستول کی جھونک میں بے چارہ شاہد تڑپ کر رہ گیا، سانس بھی نہ لے سکا۔

گھر میں اس وقت ایک عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاہد کا کمرہ بند تھا۔ نرشابہ کا کمرہ مقفل تھا۔ حسینہ بیگم کا ایوان کھلا تھا لیکن وہ اندر نہ تھیں لیکن اس صورت حال پر اس نے غور نہیں کیا۔ سیدھا تیر کی طرح اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ رشیدہ سامنے دالان میں بیٹھی ہوئی چھالیہ کتر رہی تھیں۔ اتفاق سے بوند دختر کے سامنے آگیا۔ بے چارے اس وقت رشیدہ کے احکامات کی تعمیل کے سلسلے میں باہر جا رہا تھا۔ بھلا شیر کے سامنے بکرا آجائے اور وہ چھوڑ دے۔ کس کر خالد میاں نے بغیر کسی وجہ کے ایک زوردار تھپڑ جو رسید کیا ہے غریب کے رخسار بیمار پر تو وہ ہائے ہائے کر کے دھڑام سے فرش پر۔ قسمت کی ماری شہزادی بیگم جانماز سمیٹ کر باورچی خانے سے باہر تماشہ دیکھنے آگئیں۔ بلی کے سامنے جو با، خالد میاں نے جھپٹ کر جو اسے تکلی کا ناچ نچایا ہے تو ہائے ہائے کرتی منہ کے بل زمین پر دراز۔ نکہر کو بھی اسی وقت ہونا تھا۔ پھر تو اس نے گھر سر پر اٹھا لیا۔ اس کا نالہ و شیون سنکر شرابی کو جھرجھری آئی۔ وہ بھی میدان کارزار میں پہنچ گیا اور فوراً ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس طرح تنہا بازی



## بپھرا ہوا شیر

خالد کے منہ پر شاہد کا طمانچہ ایسا بے ساختہ اور بھرپور پڑا کہ کچھ دیر تک تو وہ گم سم رہا۔ وہ شاہد جیسے مرد ضعیف سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ یوں آن کی آن میں اس کا سارا بھرم خاک میں مل جائے گا اس کی شان و شوکت، رعب و دبدبہ اور ہیبت و صولت دم توڑ توڑ دے گی۔ اس اچانک حملے سے وہ چکرا ہی گیا تھا لیکن اخلاق اور شاہد وغیرہ بھی حیران تھے کہ ایسا منحنی اور نحیف شخص یوں اپنے سے باہر ہو جائے۔ شاہد تو غصہ سے کھولتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد جب ذرا ہوش و حواس درست ہوئے تو کپڑے جھاڑتے ہوئے خالد میاں فرش زمین سے اٹھے۔ پھر واویلا، ہنگامہ، بس چلتا بس میں ہوتا تو شاہد کے پرخچے اڑا دیتے۔ اخلاق وغیرہ نے لاکھ لاکھ باتیں بنائیں اور خالد کو رد کرنے کی کوشش کی لیکن وہ توبہ

کھائی کہ دیرینہ حسرت قدرت نے خود بخود پوری کردی، یعنی پورے تن و توش کے ساتھ شہزادی کے جسمِ ناتواں پر دراز۔ گھر کیا تھا شبراتی، جو بدستور شہزادی کے شور و فغاں سے ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔"

یہ عجیب و غریب منظر دیکھ کر پہلے تو رشیدہ بت بنی کھڑی رہی پھر غرارہ کے بڑے بڑے پائنچے سنبھالتی اٹھی لیکن اتنی دیر میں خالد میاں اپنے کمرہ سے پستول لا چکے تھے۔ پستول دیکھ کر شبراتی، شہزادی اور جمیلہ کی تو گھگھی بندھ گئی۔ نہ نالہ نہ فریاد۔ رشیدہ کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ جان پر کھیل کر لاڈلے بیٹے کی طرف بڑھی کہ پستول چھین لے، لیکن سعادتمند بیٹے کے ایک بے ساختہ دھکے نے اگر سنبھل نہ گئی ہوتی تو اسے بھی شہزادی کی گرد میں پہنچا دیا ہوتا۔ وہ پھر آگے بڑھی اور اس کا پستول والا ہاتھ پکڑ کر اس نے کہا:

"خالد! آج تمہیں کیا ہو گیا ہے بیٹے؟"

خالد نے بپھرے ہوئے لہجہ میں جواب دیا:

"مار ڈالوں گا۔ زندہ نہیں چھوڑوں گا!"

رشیدہ سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے کہا:

"میرے بچے تو کیسی باتیں کر رہا ہے، ان لوگوں (شبراتی وغیرہ) نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟"

خالد نے ماں کی غلط فہمی رفع کرتے ہوئے کہا:

"آج شاہد کی موت آئی ہے میرے ہاتھوں سے؟"

اب شہزادی وغیرہ کی جان۔۔۔ میں جان آئی۔ رشیدہ نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔"

"لیکن شاہد یہاں ہے کہاں؟ جب وہ آئے تو مار ڈالنا۔"

"تم چلو کمرہ میں!"

خالد جھلا گیا:

"نہیں وہ ہے، اپنے کمرہ میں چھپا بیٹھا ہے۔ نوشابہ نے اور اس کی اماں نے اسے چھپا دیا ہوگا، میں کسی کی پروا نہیں کرتا، میں کرتا ہی اسے مار دوں گا، مار ڈالوں گا!"

نوشابہ اور حسینہ کے بارے میں ریمارک سنکر رشیدہ کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ انہوں نے سوچا یہ شہزادی حرامزادی ایک ایک کی دس دس لگائے گی پہلے تو انہوں نے شہزادی کو ڈانٹا:

"یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟ کیا کچھ اور سننے کا جی چاہتا ہے؟"

"چل بھاگ یہاں سے!"

وہ بھاگ گئی۔ پھر بیٹے سے پیار سے رشیدہ نے کہا:

"آپا اور نوشابہ تو تنویر کے ہاں گئی ہیں۔ شاہد وہیں چلا گیا ہوگا؛ یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔۔۔۔!"

یہ خبر خالد کے سمندِ عزم پر تازیانہ ثابت ہوئی، اس نے بڑی آمادگی سے کہا:

"تو میں وہاں جاتا ہوں۔۔۔۔۔۔ ہٹو یہاں سے!"

رشیدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے:

"اچھا پہلے گولی مجھ پر چلا دے۔ جب میں مر جاؤں، تب جانا!"

خالد ان آنسوؤں سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا! اس نے کہا:
"میرے راستے کا پتھر نہ بنو اماں، میں بہت خراب آدمی ہوں مجھے جانے دو۔ میں آج فیصلہ کر کے رہوں گا!"

اتنے میں خبر گرم ہوئی، ڈاکٹر صاحب کھانا کھانے تشریف لا رہے ہیں"

رشیدہ نے بڑے پیار سے شہزادی کو پکارا:
"بیٹی! بھائی صاحب کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ آپا تو تنویر کے ہاں گئی ہیں، تو جلدی سے کھانا نکال، میں ابھی آئی!..."
"شاباش بڑے کام کی ہے ہماری شہزادی!"
شہزادی گردن جھکا کر چلی گئی۔

رشیدہ، خالد کو گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں لے گئیں۔ اسے ایک کرسی پر بٹھایا۔ خود کھڑی رہیں۔ پھر نہ جانے کیا جی میں آئی، کہ دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے ... ہیں ... اور گویا ہوئیں:
"بیٹے ماؤں کے ارمان پورے کرتے ہیں، تو میرے ارمانوں کو پاؤں تلے روند رہا ہے! اولاد سے ماؤں کو سکھ ملتا ہے، تو میری جان کا گاہک ہو رہا ہے۔ میں تیری زندگی بنانا چاہتی ہوں، تو اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہا ہے۔ میں نوشابہ کو تیری دلہن بنا کر اس گھر کا مالک بنانا چاہتی ہوں۔ تو نے اس وقت اس کی اور اس کے ساتھ آپا کی بھی مٹی پلید کر دی! اب میں انہیں کیا منہ دکھاؤں گی؟ یہ موئی شہزادی تو جنگ سرچ لگا کر نہ جانے کس کس طرح پھیلائے گی آپا کو!"

خالد خاموشی کے ساتھ ماں کی باتیں سنتا رہا، پھر اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا:
"میں اپنا مستقبل خود بناؤں گا۔ مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ نوشابہ ذلیل، بدمعاش اور آوارہ ہے میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ اس کی بھی شامت آئی ہے! کیا تم سمجھتی ہو میں صرف شاہد کو ماردوں گا؟ نہیں شاہد کے ساتھ نوشابہ کی لاش بھی رقص بسمل کرتی تڑپتی، پھڑکتی نظر آئے گی۔"

رشیدہ نے خالد کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ذرا غصے کے ساتھ بولیں۔
"حرام خور! اپنی زبان بند کر، ورنہ گلا گھونٹ دوں گا تیرا!"
خالد نے کہا:
"گھونٹ دینا! ........ لیکن جب میں شاہد اور نوشابہ کو قتل کر لوں، تب!"

پھر رشیدہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ پھر اس نے گھگھیا کر بڑے درد بھرے لہجے میں کہا:
"خدا کے لئے اپنی زبان بند رکھ لڑکے!"
"کیوں؟ ........ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ نہ تمہارے بھائی صاحب سے، نہ تمہاری آپا جان سے! یہ دونوں دیوث ہیں۔ نوشابہ اور شاہد کا کورٹ شپ انہی کی مرضی سے ہو رہا ہے!"

رشیدہ نے ادھر اُدھر دیکھا، کہیں کوئی سن تو نہیں رہا ہے۔ اسے یاد نہیں رہا تھا کہ دیوار بہ گوش دارد۔ شہزادی دیوار سے لگی ایک ایک بات سن رہی تھی اور دل کی مشین میں ٹیپ ریکارڈ کر رہی تھی!

بڑی بے بسی کے ساتھ رشیدہ نے کہا:

"تو نہیں بچے گا، کون ہوں اس گھڑی سے!"

بے پروائی سے خالد نے کہا:

"گھبراؤ! ابھی ذرا دیر میں تم سے آکر ملتا ہوں۔ پہلے ان دونوں... بدمعاشوں کو ٹھکانے لگاؤں ...... یہ کسی قیمت پر آج نہیں بچ سکتے میرے ہاتھ سے!"

دفعتاً رشیدہ کی نظر نور نظر اور لخت جگر کے سوجے ہوئے گال پر پڑی۔ وہ چونک پڑی۔ اس نے کہا:

"میرے لال یہ کیا ہوا؟ —— تیرا گال کیوں سوجا ہوا ہے"

خالد نے زہرخند کرتے ہوئے جواب دیا:

"پٹ کر آرہا ہوں"

ایک بھری ہوئی شیرنی کی طرح گرج کر رشیدہ نے دریافت کیا:

"تو پٹ کر آرہا ہے؟ تجھے کس نے مارا؟ ... کیوں؟ کس لئے؟"

خالد نے طنزیہ لہجہ میں کہا:

"نام پوچھنا چاہتی ہو اس رستم دوراں کا؟"

رشیدہ نے اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا:

"ہاں! ...... کس نے تجھے پیٹا، کس نے تجھے مارا؟ میں اس کا منہ نوچ لوں گی، میں اپنے کمزور ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دوں گی!"

خالد نے ایک قہقہہ لگایا ...... کتنا زہریلا تھا یہ

قہقہہ! پھر گویا ہوا:

"یہ حرکت ہے نوشابہ کے عاشق جانباز شاہد کی! اس نے مجھے مارا بھرے مجمع میں، دوستوں کی پارٹی میں! اس نے مجھے ذلیل کیا، اس نے میری توہین کی، اس نے مجھے پیٹا! کیا اس جرم کی سزا قتل کے سوا کچھ اور ہو سکتی ہے؟ کیا اب بھی تم منع کرو گی کہ اس گھر کے عزت داری اسی طرح گھر سے اڑا جاتے ہیں اور میں اپنی عزت کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں جان سے نہ ماروں؟ ...... بولو امّاں، خاموش کیوں ہو؟"

رشیدہ کچھ سوچنے لگی۔ پھر اس نے کہا:

"شاہد تو بے شک گردن زدنی ہے، لیکن نوشابہ کیوں ---؟ اس کا نام نہ لو"!

خالد نے صلح کا یہ فارمولا نہیں قبول کیا:

"نوشابہ! ...... ہونہہ! تم سمجھتی ہو وہ معصوم ہے، نادان ہے، الھڑ ہے! نہیں وہ شیطنی چلتی ہوئی ہے۔ شاہد کو دیکھ کر اس کے چہرے پر شادابی آجاتی ہے! تم نے نہ دیکھا ہوگا، میں دیکھتا رہتا ہوں، تمہیں یاد ہے، آج کی پارٹی میں شاہد ایک نہایت شاندار سوٹ پہن کر گیا تھا۔"

رشیدہ کو یاد آگیا:

"ہاں، ہاں، پھر؟"

"تو سن لیا کان کھول کر، وہ محبوبہ دل نواز نوشابہ نے اپنے عاشق جانباز شاہد کے لئے، خود بازار جاکر منہ مانگی قیمت دے کر خریدا تھا۔ پھر یہ سوٹ زیب تن کرکے اس کے جمال

جہاں آرا کا نظارہ اسے آئینہ کے سامنے کھڑا کر کے کیا تھا۔
کہدو جھوٹ، جھٹلا دو میری آنکھوں کو نہ دے مشاہدہ کو۔
نہیں میں جھوٹا نہیں سمجھا ہوں اور ان دونوں کو مار کر رہوں گا۔"
رشیدہ نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ شہزادی آکر
سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس نے بڑی معصومیت سے کہا:"
کھانا نکال دیا صاحب آگئے!"
رشیدہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا:"
"صاحب آگئے؟ ۔۔۔۔۔ چل میں آئی"۔
شہزادی چلی گئی۔ رشیدہ نے اپنا دوپٹہ اتار کر خالد کے
پاؤں پر رکھ دیا۔"
اس کی لاج رکھو ۔۔۔۔۔ جب تک میں نہ آجاؤں،
کمرہ سے باہر نہ نکلنا!"
وہ چلی گئی ـــــ"



# بناوٹ

رشیدہ جب حسینہ کے کمرہ میں پہنچی تو ڈاکٹر صاحب کھانا
شروع کر چکے تھے۔ رشیدہ کو دیکھ مسکرائے، فرمایا:"
"اور رشیدہ! ۔۔۔۔۔ تمہاری آپا حسینہ ابھی نہیں آئیں
آب تک؟"
رشیدہ نے بیٹھتے ہوئے کہا:"
"ہاں بھائی صاحب، آپا ابھی تک نہیں آئیں۔ تنویر کے ہاں
بہت دنوں کے بعد گئی ہیں اس نے روک لیا ہوگا۔"
ڈاکٹر صاحب نے لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا
"تم نہیں گئیں؟ ۔۔۔۔۔ کچھ خفا ہو اس سے؟"
رشیدہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی:"
میری اتنی کہاں مجال کہ کسی سے خفا ہو سکوں؟"

ڈاکٹر صاحب کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا۔
"آج اس قدر خاکساری کی ضرورت کیا پیش آگئی ہے؟"
رشیدہ نے کہا۔
"بھائی صاحب آپ بھی سنا لیجئے!"
ڈاکٹر صاحب نے آنکھ اٹھائی تو رشیدہ کی آنکھ میں آنسو جھلک رہے تھے۔ لقمہ بابو کا ہاتھ میں رہ گیا۔
اضطراب کے ساتھ پوچھا:
"کیا ہوا بھئی؟"
رشیدہ نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے۔ کہنے لگی:
"کچھ نہیں بھائی صاحب۔"
ڈاکٹر صاحب نے اصرار سے دریافت کیا:
"کچھ تو کہو کیا بات ہے"
رشیدہ نے کہا:
"کچھ نہیں ہوتا کیا، جو قسمت دکھا رہی ہے دیکھ رہے ہیں!"
ڈاکٹر صاحب کو ان اکھڑی اکھڑی باتوں سے بڑی حیرت ہوئی
پوچھا:
"یہ کس قسم کی باتیں کر رہی ہو؟"
وہ بولی:
"آپا کا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ آجائیں ...."
"تو کیا ہوگا؟" ڈاکٹر صاحب نے کہا:
"ان سے اجازت لے کر کہیں اور اٹھ جاؤں گی!"



اب تو ڈاکٹر صاحب کے کان کھڑے ہوئے:
"تم یہ گھر چھوڑ دوگی؟ چلی جاؤگی یہاں سے؟"
"لیکن کیوں؟ کہاں؟"
رشیدہ کے لئے گریۂ بے اختیار پر قابو پانا ممکن نہ رہا۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا:
"بھائی صاحب، یہ نہ پوچھئے، آپ کو بھی برا لگے گا، آپا بھی خفا ہوں گی، بہتر تو یہ ہے کہ میں راستہ سے ہٹ جاؤں۔ اللہ آمین کا ایک ہی بچہ خدا نے دیا ہے۔ میں نہ اس کی ذلت سہہ سکتی ہوں نہ بھائی برداشت کر سکتی ہوں!"
ڈاکٹر صاحب نے حیرت سے رشیدہ کی باتیں سنیں۔ پھر فرمایا:
"آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو رشیدہ، ایسی بے سر پیر کی باتیں؟ مجھے کیوں برا لگے گا، تمہاری آپا کیوں خفا ہوں گی؟ تمہارے بچے کو کس نے ذلیل کیا؟ کس نے پیٹا؟ کہیں چرس تو نہیں پینے لگی ہو؟"
یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے ایک قہقہہ لگایا۔
رشیدہ اٹھی۔ بجلی کی سی تیزی سے خالد کے کمرہ میں پہنچی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی لائی اور اس کا منہ پکڑ کر گال بالکل ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں کے قریب کر دیا۔ انہوں نے حیرت سے کہا:
"یہ تو سوجا ہوا ہے، کیا ہوا؟ کچھ بتاؤ تو سہی!"
"یہ تو جا کر اپنے کمرہ میں! بھائی اگر شاہد کے ماموں ہیں تو میرے بھی خالو ہیں، اور بچے تو دو بیٹے کی طرح جاتے ہیں۔ زہر کھائیں بڑے دشمن

رہوں گی ان سے! تو گھبراتی کیوں ہے جا میرے چاند اپنے کمرہ میں جا!"

خالد گردن جھکائے اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے تیوری پر بل ڈال کر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔"

شاہد نے مارا خالد کو؟"

رشیدہ روتے ہوئے بولی:

"ہاں بھائی صاحب، شاہد نے مارا ہے میرے بچہ کو!"

ڈاکٹر صاحب کو غصہ آگیا۔ ڈپٹ کر پوچھا:

"کیوں، کس لئے، کوئی خطا کی تھی خالد نے؟"

رشیدہ نے المناک حال میں خالد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا:

"وہ تو اللہ میاں کی گائے ہے، کیا خطا کرے گا کسی کی، نہ کسی کے بھلے میں نہ برے میں۔ ہاں لیکن ایک خطا اس کی بہت بڑی ہے اور واقعی نہیں معاف کی جاسکتی کسی طرح!"

یہ کہہ کر رشیدہ چپ ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ رشیدہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

"اس کی خطا یہ ہے کہ آپ اسے اولاد کی طرح چاہتے ہیں۔ وہ سعادت مند ہے، گستاخ نہیں، نظرباز نہیں، رنگا سیار نہیں، کسی کو برائی کرتے دیکھتا ہے تو ٹوک دیتا ہے، جس گھر میں ماشاءاللہ جوان جہان لڑکی موجود ہو، وہاں نوجوان ملازموں سے چہلیں کون گوارا کرسکتا ہے؟ شہزادی کو چھیڑ رہے تھے شاہد میاں بالکل نوشابہ کے کمرے



یہ کیا بے ہودگی ہے، گھر میں اس طرح کی حرکتیں! خالہ جان کی عزت کا بھی خیال نہیں؟ وہ بھرپور ہاتھ جڑا ہے کہ اگر آپ کا ڈر نہیں ہوتا تو خون خرابہ ہو جاتا اس گھر میں! خالد پستول نکال لایا تھا۔ پھر میں نے پستول چھینا تو زہر کھانے لگا!"

یہ کہہ کر رشیدہ نے پھر ہچکیوں ہچکیوں رونا شروع کردیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا:

"اور تمہاری آپا یہ سارا تماشہ دیکھتی رہیں؟"

رشیدہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

"وہ تو نوشابہ کے ساتھ تنویر کے ہاں جا چکی تھیں، لیکن وہ ہوتیں بھی تو کیا کرتیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے ذرا بگڑتے ہوئے لہجہ میں کہا:

"کیوں کچھ نہیں کرسکتی تھیں؟"

رشیدہ نے ٹھنڈی سانس لیکر جواب دیا:

"جب سے حمیدہ کا انتقال ہوا ہے، وہ شاہد سے کچھ نہیں کہتیں کبھی بھی۔ میں کچھ کہوں گی تو وہ (ڈاکٹر صاحب) فرمائیں گے کہ میرے یتیم یسیر بھانجے کو بھی یہ عورت برداشت نہیں کرسکتی۔ حد یہ ہے کہ وہ پردہ تک ٹوٹ گیا جو نوشابہ سے ہوتا تھا بلکہ اور غضب یہ کہ وہ پڑھانے کے بہانے نوشابہ کے کمرہ میں گھسا رہتا ہے۔ مگر آپا آپ کے خیال سے خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی ہیں کچھ نہیں کہتیں!"

ڈاکٹر صاحب حیران و ششدر رشیدہ کی باتیں سنتے رہے پھر انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:"

"میرا خیال۔۔۔۔۔! عجب مہمل بات ہے یہ بھی کوئی بدمعاشی کرے گا اور میں اس سے خوش رہوں گا، شاہد کی بے ہودگیوں کے بارے میں خود تمہاری آپا نے مجھے کئی واقعے بتائے تھے۔ اسی لیے انہوں نے تو شاہد کا پردہ بھی اس سے کروایا تھا۔ اور میں نے اس فیصلہ کی تائید بھی کی تھی۔ حمیدہ کے انتقال کا بے شک مجھے بہت صدمہ ہوا تھا اور اس کی بے کس موت نے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے۔ اس کی تنہا یادگار یہی شاہد تھا۔ قدرتاً حمیدہ کا لگاؤ اس کی طرف منتقل ہوا۔ میں نے اسے رکھ لیا۔ وہ رہنے لگا۔ پھر اس کے بعد تمہاری آپا نے اس کی کوئی شکایت نہیں کی اس کے بارے میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں بتائی۔ میں سمجھا، حالات نے اس کی اصلاح کر دی ہے لیکن تمہاری باتیں سن کر تو میں سناٹے میں آگیا، اس کے معنی تو یہ ہیں اس کی ذرا بھی اصلاح نہیں ہوئی، بلکہ وہ کچھ اور بگڑ گیا ہے۔۔۔۔۔" نہیں اب یہ نہیں برداشت کر سکتا۔ اس گھر میں صرف وہی رہ سکتا ہے جو میرے اصولوں سے، میری عزت سے، میرے وقار سے، میرے حکم سے ٹکرانے کی جرأت نہ کرے۔ شاہد اگر ایسا نہیں کر سکتا تو اسے کوئی دوسرا انتظام کر لینا چاہیے۔ وہ اتنا بڑا ہو چکا ہے کہ آسانی سے اپنا بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ خیر تم ابھی آپا کو کچھ نہ بتانا۔ میں اس معاملے کا



آخری طور پر فیصلہ کر دوں گا۔۔۔۔۔ خالد!۔۔۔۔"

خالد فوراً اپنے کمرے سے باہر آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے گلے لگایا۔ پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"اس طرح کی حرکتیں آئندہ نہ ہو سکیں گی۔ نہ تمہیں پستول استعمال کرنے کی ضرورت ہے نہ زہر کھانے کی!"

خالد سر جھکائے کھڑا رہا۔ ڈاکٹر صاحب باہر برآمدے میں تشریف لے گئے۔ رشیدہ کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا۔

# سنّاٹا

حسینہ نے بڑی کوشش کی کہ شام کو جلدی گھر واپس آجائے، لیکن تنویر کا اصرار بار بار اسے روکتا رہا۔ کھانے پینے، بات چیت اور داستان سرائی میں رات کے گیارہ بج گئے۔ وہ جب تنویر کے ہاں سے رخصت ہو کر گھر پہنچی۔ ڈاکٹر صاحب خواب خرگوش میں مصروف ہو چکے تھے، ان کا معمول تھا، رات کو دس بجے پابندی سے سو جاتے اور صبح ٹھیک چار بجے اٹھ جاتے۔ رشیدہ کا دن رات کو ہوتا تھا۔ تمام معاملات و مسائل پر سنجیدہ اسی وقت تبادلہ خیال کرتی تھیں جب سارا گھر سو جاتا تھا، اور یہ اندیشہ نہ رہتا کہ کوئی ان کی کان لگا سکتا ہے۔ پھر یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہتا کبھی کبھی تو رات



کے دو بج جاتے۔ لیکن آج دس ہی بجے سے موت کا سناٹا ان کی طرف کے حصہ میں چھا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا سب گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔ شاہد کا مطالعہ رات کے بارہ ایک بجے تک جاری رہتا تھا لیکن اس کے جاگنے سے گھر کے نظام میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ دالان سے ملا ہوا جو کمرہ تھا وہی اس کا مسکن تھا۔ وہاں کی ہلکی ہلکی روشنی جھانک جھانک کر حسینہ بیگم کی آنکھوں تک پہنچتی رہتی تھی جس سے وہ اندازہ لگاتی رہتی تھیں کہ شاہد کب تک جاگتا ہے ... اور کبھی کبھی وہ اس کی خیریت بھی ضرور دریافت کر لیتی تھیں لیکن آج شاہد کا کمرہ بھی سنسان پڑا تھا۔ نہ روشنی نہ زندگی کے آثار نظر آتے تھے۔

حسینہ اور نوشابہ ساتھ ساتھ موٹر سے اتریں، شاہد کے کمرہ کے پاس سے گزریں تو روشنی ندارد اور کمرہ بند۔ چلتے چلتے نوشابہ نے پوچھا۔

"ارے یہ کیا؟ شاہد کہاں چلا گیا؟"

نوشابہ نے رک کر دروازے پر ہاتھ لگایا۔ باہر سے زنجیر بند تھی۔ کہنے لگی:-

"معلوم نہیں آج کہاں رہ گئے؟ کمرہ باہر سے بند ہے۔ شاید سینما چلے گئے ہوں؟"

حسینہ نے جواب دیا۔

"نہیں! وہ رات کو کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالتا!"

اتنے میں ڈاکٹر صاحب کا کمرہ آ گیا تھا۔ کہنے لگیں "ابھی سے تمہارے باپ تو سو گئے شاید؟"

نوشابہ بولی:-

"ہاں امی جی! وہ تو پابندی سے دس بجے سو جاتے ہیں؟"
حسینہ نے پوچھا۔

"اور رشیدہ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ آج تو وہاں بھی سناٹا چھا گیا ہے۔"
نوشابہ کہنے لگی۔

"معلوم ہوتا ہے آج سب نے خواب آور گولیاں کھا لی ہیں۔"
حسینہ نے فکرمند لہجہ میں کہا:

"خدا خیر کرے۔ مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے؟"
نوشابہ نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ شہزادی آ گئی۔ اسے دیکھ کر حسینہ نے پوچھا:

"کیوں ری آج سوتا کیوں پڑا ہے سارے گھر میں؟ شاہد بھی نہیں ہے؟"

شہزادی نے رازدارانہ لہجہ میں کہا:

"اب وہ کیا آئیں گے۔"

حسینہ اور نوشابہ کپڑے بدلنے جا رہی تھیں، دونوں رک گئیں۔ حسینہ نے پوچھا:

"کیوں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ کیوں نہیں آئے گا؟ کیا کسی نے نکال دیا اسے؟"

وہ بولی:

"بی بی! یہ تو میں نہیں کہہ سکتی۔ لیکن خدا کو دیکھا نہیں، عقل سے پہچانا ہے۔"

حسینہ نے کپڑے بدلنے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ نوشابہ بھی ٹھٹک کر اپنے کمرہ میں جاتے جاتے کھڑی ہو گئی۔ شہزادی سے کہنے لگی:

"آخر بات کیا ہے، صاف صاف کیوں نہیں کہتی؟"

وہ رونے لگی۔

"اتنا پٹی ہوں کہ اب تک بدن درد کر رہا ہے۔ میرے منہ سے کچھ نکل گیا تو شاید خالد میاں قمچی سے مار ہی ڈالیں گے۔"

بہرحال فقط حسینہ اور نوشابہ کے لئے حیرت اور استعجاب کا سامان پیدا کر رہا تھا۔ حسینہ نے آہستہ سے لیکن سخت لب و لہجہ میں کہا:

"ماں زادی! پورا واقعہ کیوں نہیں بتاتی؟"

شہزادی نے یہ تمہید اس لئے باندھی تھی کہ مفصل داستان سننے کا اشتیاق ان لوگوں میں پیدا ہو جائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور پھر اس نے ساری داستان از اول تا آخر بغیر نمک مرچ لگائے سنا دی۔ نمک مرچ لگانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ سارے واقعات بجائے خود اتنے زوردار تھے کہ شاہکار کی حیثیت رکھتے تھے۔

ساری داستان سننے کے بعد حسینہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا:

"تو یہ بات ہے! ذرا دیر کے لئے میں گھر سے باہر گئی اور یہاں انقلاب آ گیا۔ اب تو اس گھر میں رشیدہ رہے گی یا میں، یا خالد رہے گا یا نوشابہ!"

نوشابہ جھٹ سے بول پڑی:

"لیکن امی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ بات کیا ہوئی؟ شاید بھیا ایسے آدمی نہیں ہیں، خواہ مخواہ کسی کے اندر وہ بھی کوئی اور نہیں خالہ جانی

کے منہ پر ایسا طمانچہ ماروں کہ پانچوں انگلیوں کے نشانات گال پر ابھر آئیں اور گر سوچ جائے! ضرور کوئی بہت اہم بات ہوئی ہوگی!"

حسینہ نے کہا:

"ہاں جی میں بھی تو یہی سوچ رہی ہوں۔ شاید ایسا لڑکا بھی ہے کہ کسی سے لڑنے جھگڑنے اور پھر میرے خیال سے وہ خالد کا ساتھیاں کرتا ہے کہ اس کی بے ہودگیوں تک کو نظر انداز کر جاتا ہے!"

نوشابہ کہنے لگی

"ہاں اور کیا! اس دن دیکھ لیجئے خود خالد بھائی نے شاہد بھائی کو ہاکی سے خون خون کر دیا۔ مگر انہوں نے بدلا لینا تو درکنار شکایت تک نہیں کی ہے۔ بلکہ میں نے اور آپ نے پوچھا بھی تو گول کر گئے۔"

حسینہ بیگم بولیں:

"ہاں بھئی! ہمیں بھی سوچ رہی ہوں"

نوشابہ کہنے لگی!

"لیکن امی جی! خالد نے تو آپا جی کو بھی شاہد بھیا سے برگشتہ کر دیا۔ شہزادی کہہ تو رہی تھی، شاید انہیں سن گن مل گئی ہو، ابھی سے نہ آئے ہوں!"

حسینہ کو غصہ آ گیا۔ بولیں:

"تب رہ گئی!۔۔۔۔ آپا جی کو برگشتہ کر دیا، کوئی ہنسی کھیل ہے۔ آپا جی کو برگشتہ کرنا! اگر میں ان سے برگشتہ ہو گئی تو دن میں تارے نظر آ جائیں گے تمہارے آپا جی کو!"

نوشابہ زیر لب مسکرانے لگی۔ پھر پوچھا:

"آخر شاہد بھیا اب تک آئے کیوں نہیں؟"

حسینہ نے کہا:

"ممکن ہے کسی دوست کے ہاں رک گیا ہو کوئی کام ہے! بہرحال وہ ٹھیک نہیں ہے کہ خالد کے لیتوں سے ڈر کر گھر چھوڑ دے!"

نوشابہ نے شہزادی سے کہا:

"جاؤ دیکھو شاید آ گئے ہوں شاہد بھیا اپنے کمرے میں"۔

شہزادی تعمیل حکم کے لئے روانہ ہوئی۔ اس کے جانے کے بعد حسینہ نے کہا:

"اب رشیدہ کھل کر میدان میں آ گئی ہے جس سے میں ڈرتی تھی وہ آ گیا۔ اب مجھے صاف صاف بات کرنی پڑے گی:"

اتنے میں شہزادی مسکراتے ہوئے آئی اور کہنے لگی:

"آ گئے۔۔۔۔۔ ابھی آئے ہیں!"

حسینہ نے حکم دیا:

"جا بلا لا!"

وہ چلی گئی۔

# فائر

شاہد اگر حسینہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر بیزاری اور تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ نوشابہ نے اس پر ایک نظر ڈالی اور سر جھکا لیا۔ حسینہ نے اسے دیکھا اور کہا:

"بیٹھ کیوں نہیں جاتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیٹھو!"

وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

حسینہ نے پوچھا

"آج اتنی دیر تک کہاں رہے؟"

اس نے ادب سے جواب دیا۔

"جی ہاں دیر ہو گئی۔"

نوشابہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا:

"آج دن بھر کیا کیا کرتے رہے آپ؟"

شاہد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا:

"کچھ بھی نہیں۔"

تو نوشابہ پھر مسکرائی اور ایک ادا کے ساتھ اس نے پوچھا:

"کسی سے لڑائی جھگڑا تو نہیں کیا؟"

شاہد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حسینہ نے کہا:

"مجھے رتی رتی حال معلوم ہو چکا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم نے خالد کو مارا کیوں تھا؟"

نوشابہ بول پڑی۔

"کوئی ایسی ہی بات ہوگی، ورنہ کہیں ان کا ہاتھ اٹھ سکتا ہے کسی پر۔ ان سے تو چیونٹی بھی نہ ماری جائے۔"

شاہد پر اس وقت عجب کیفیت طاری تھی وہ بولا:

"جی ہاں ایسی ہی بات تھی۔"

"کیا؟" حسینہ نے پوچھا۔

"یہ نہ پوچھئے" شاہد نے کہا۔

"بتا بھی دیجئے" نوشابہ مسکاتی ہوئی بولی۔

"ہاں بیٹے! بات تو معلوم ہونی چاہیے تھی۔ شاید معلوم نہیں یہاں تو خالد اور رشید نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔"

اور پھر شہزادی سے جو کچھ انہوں نے سنا تھا سب سنا دیا۔ شاہد غور سے سنتا رہا، پھر گویا ہوا:

"ممانی جان! میں اپنی پوزیشن سمجھتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں، خالد

کے سامنے میری ایک بھی نہ چلے گی۔ ماموں اسے مانتے ہیں، آپ کا تو وہ عاجز ہی ہے لیکن آج ایک ایسی بات ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج ایک ایسی بات ہوئی ۔ ۔ ۔"

پھر وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے کہا:

"اگر میرے پاس پستول ہوتا تو میں خالد کو مار ڈالتا۔"

یہ باتیں سن کر حسینہ اور نوشابہ دونوں پر ایک اضطراب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ حسینہ نے پوچھا:

"آخر ہوا کیا تھا؟"

شاہد نے پارٹی کا سارا ماجرہ سنا دیا، پھر کہا

"آپ میرا کتنا خیال کرتی ہیں، اس کا علم خدا جانتا ہے، میرا خدا جانتا ہے، لیکن اگر آپ مجھ سے نفرت کرتی ہوتیں، جیسی اماں کی آخری زندگی میں کرنے لگیں تھیں۔ تب بھی نوشابہ کے بارے میں اتنے ذلیل اور رکیک الفاظ سن کر میں بے قابو ہو جاتا اور وہی کرتا جو کر چکا ہوں ــــــ خالد کو اگر اپنے پستول پر ناز ہے تو میرا سینہ حاضر ہے۔ ان کی والدہ اگر گالی گالی کر کے اور ماموں ان کی بات پر برہم ہو کر مجھے اس گھر سے نکال دینا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی عذر نہیں چلا جاؤں گا، لیکن میں نے جو کچھ کیا ہے، اس پر نادم نہیں ہوں اور آئندہ بھی اگر خالد صاحب نے اپنی زبان قابو میں نہ رکھی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ وہ میرے دشمن ہو جائیں، مجھے اذیت دیں، مجھے ذلیل کریں، مجھ پر فقرے کسیں، میرا مذاق اڑائیں۔ میری عزت پر تمسخر کریں، میری مفلسی اور غربت کی داستانیں بڑے مزے لے لے کر بیان کریں، میری مفت خوری اور نمک حرامی کا ڈھنڈورا پیٹیں، میری مجبوری اور بے بسی پر طنز و تعریض کریں، یہ سب کچھ گوارا کر لوں گا۔ لیکن ایک معصوم اور فرشتہ سیرت لڑکی کے بارے میں اگر ان کا گندہ ذہن کھلے گا تو میں زبان کھینچ لوں گا! ۔ ۔ ۔"

"ممانی! نوشابہ اگر آپ کی اور ماموں کی لڑکی نہ ہوتی تو بھی اپنی ذات سے وہ اتنی اچھی ہے کہ میں اس کی توہین نہیں برداشت کر سکتا تھا!"

نوشابہ سر جھکائے اپنی تعریف سنتی رہی۔ حسینہ نے ایک ایک لفظ غور سے سنا اور گرہ میں باندھ لیا۔ پھر گویا ہوئی۔

"دیکھا جائے گا، تم فکر نہ کرو!"

شاہد نے کہا:۔

"پہلے تو میرا ارادہ نہیں تھا لیکن اب ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں"

حسینہ نے آمادگی کے ساتھ سراپا گوش بن کر کہا:

"کہو، کہو"

شاہد نے کہا:

"اب مجھے یہاں نہ رہنا چاہیے، مجھے اجازت دیجئے کہ چلا جاؤں کہیں!"

نوشابہ خاموش نہ رہ سکی:

"تاکہ وہ لوگ سمجھیں آپ ڈر گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا ــــــ کیوں امی جی؟"

حسینہ بیگم نے بیٹی کے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا:

"اور کیا، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جسے رہنا ہو رہے، جسے جانا ہو چلا جائے، مگر شاہد یہیں رہے گا۔ یہ اس کا گھر ہے دوسروں کی خاطر کوئی

اپنا گھر نہیں چھوڑ دیتا"

ابھی شاہد نے کوئی جواب نہ دیا تھا کہ نوشابہ نے پوچھا:

"بتائیے کیا فیصلہ کیا آپ نے"

شاہد اپنا تبسم ضبط نہ کر سکا۔ کہنے لگا،

"نہ جاؤں گا"

حسینہ بیگم بولیں:

"بیٹے اب جاؤ سو رہو، کافی رات آگئی ہے۔ صبح ناشتہ تمہیں میرے کمرہ میں آکر کرنا۔ وہ ڈاکٹر صاحب بھی وہیں ہوں گے۔ ان کے سامنے سارا ماجرہ رکھ کر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بات صاف کر لوں گی ——
ہاں تم نے کھانا بھی کھایا ——"

شاہد اس سوال پر ٹھٹھک گیا۔ نوشابہ نے اس کی طرف سے جواب دیا

"نہیں ——"

شاہد مسکرانے لگا:

"لیکن اب نہیں کھاؤں گا، بہت دیر ہو گئی ہے۔ طبیعت خراب ہو جائے گی۔ ویسے طبیعت بھی بھاری ہے صبح ناشتہ زیادہ کروں گا۔"

یہ کہہ کر شاہد باہر نکلا۔ شہزادی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی۔ حسینہ اور نوشابہ نے اپنا بستر ٹھیک کرنا شروع کیا۔ ایک فائر کی آواز آئی اور اس کے ساتھ چیخ گونجی۔ حسینہ اور نوشابہ ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی باہر آئیں۔ شہزادی نے روتے ہوئے کہا۔

"ہائے غضب ہو گیا"

سامنے شاہد زمین پر پڑا تھا اور تازہ تازہ خون اس کی گردن سے ابل رہا تھا۔

———



# حادثہ کا اثر

فائر کی ہیبت ناک آواز اور شہزادی کی دل دوز چیخ نے گھر کے سناٹے کو ہلچل سے بدل دیا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب شب خوابی کا لباس پہنے اپنے کمرے سے گھبرائے ہوئے برآمد ہوئے۔ شاہد زمین پر خون میں لت پت پڑا تھا۔ نوشابہ بیگم تصویر بنی خاموش کھڑی تھی۔ حسینہ کا نالہ جانکاہ آسمان تک جا رہا تھا۔ شہزادی کی سسکیوں اور ہچکیوں نے عجیب بھیانک فضا پیدا کر دی تھی۔ ڈاکٹر نے چیخ کر کہا۔

"موٹر!"

پھر جلدی سے شاہد کو گود میں اٹھا لیا۔ خداداد شیرازی نے بھی ہاتھ بٹایا۔ باہر آئے تو کار دروازے پر لگ چکی تھی۔ شاہد کو جلدی سے ڈالا اور سیدھے ہسپتال روانہ ہو گئے

سب کچھ اتنا اچانک اور خلاف توقع ہوا تھا کہ کسی کی سمجھ میں نہیں

"آپا کو یہ کیا ہو گیا؟" نوشابہ بیگم تصویری خاموش کھڑی تھی۔ حسینہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ رشیدہ مجرم کی طرح سر جھکائے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے پاؤں لرز رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا ابھی کھڑے کھڑے گر پڑے گی۔
حسینہ نے روتے ہوئے کہا۔

"میرے بچہ کا قاتل کہاں ہے؟ اسے میرے سامنے لاؤ میں اپنے ہاتھ سے اس کا گلا گھونٹ دوں گی۔ میرا بچہ کہاں ہے؟ زندہ ہے یا مر گیا؟ لوگو اتنا ظلم نہ کرو۔ اگر وہ مر گیا ہے تو مجھے بھی مر جانے دو۔ میں اس کے پاس جاؤں گی۔ مجھے لے چلو جہاں وہ ہے۔ وہیں مجھے لے چلو!"

یہ کہتے کہتے وہ تیورا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر نوشابہ بھی ضبط نہ کر سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شہزادی پہلے سے رو رہی تھی۔ اب اسے بھی موقع مل گیا اور اس کے گریۂ فلک رسا سے سارا گھر گونج اٹھا۔ رشیدہ نے شہزادی کی مدد سے جلدی جلدی حسینہ کو اٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔ اس کے منہ پر پانی چھڑکا اور پنکھا جھلنے لگی۔ لیکن حسینہ کے دانت بھنچ گئے تھے، وہ بالکل بے ہوش پڑی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ ذرا دیر میں ڈاکٹر صاحب اندر آ گئے۔ نوشابہ انہیں دیکھ کر اور زیادہ بلک بلک کر رونے لگی۔ انہوں نے اسے کلیجے سے لگا لیا اور کہا:

"میری بچی تو رو کیوں رہی ہے؟"

نوشابہ نے روتے ہوئے کہا:

"ابی جی۔۔۔"

اور پھر وہ رونے لگی۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا:



"انہیں کیا ہوا؟"

شہزادی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"بے ہوش ہو گئی ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب فوراً کمرے میں پہنچے۔ اب حسینہ کو ہوش آ چکا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر صاحب کو دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی اور بڑے درد بھرے لہجے میں پوچھا:

"میرا بچہ۔۔۔"

ڈاکٹر صاحب نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا:

"وہ زندہ ہے، وہ اچھا ہو جائے گا۔ گولی اس کی گردن کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی۔ ہاں ہاں خدا نے بچا لیا۔"

حسینہ کے چہرے پر یہ الفاظ سن کر رونق آ گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا

"اب سو رہو۔ صبح تم بھی چلنا ہسپتال میرے ساتھ۔ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا، میں غلط تو نہیں کہتا۔"

# آزمائش

جو گزرتے ہیں داغؔ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں؟

# زہر

شاہد کا قیام ہسپتال میں طویل ہو گیا گولی کا زخم تو بہت زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن ڈاکٹر کی کسی بد احتیاطی کے باعث وہ زہر آلود ہو گیا خون پہلے ہی کافی نکل چکا تھا، کمزوری اور پھر یہ تازہ مصیبت۔ اس کی جان پر بن گئی۔ خود ڈاکٹر علی الاعلان کہہ رہے تھے کہ شاہد خطرہ سے باہر ہے، لیکن بعد افسوس یہ کہتے تھے کہ جان کسی طرح مشکل میں ہے۔"

ڈاکٹر دلاور کا ایک پاؤں گھر میں تھا، ایک ہسپتال میں۔ مطب کی ذمہ داریاں الگ۔ مطب میں مریضوں کا تانتا لگا رہتا۔ اسپتال میں شاہد کی دوا دوش کے لئے صبح شام جانا پڑتا اور گھر پہنچتے تو بیوی (حسینہ) موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا نظر آتی۔ شاہد کے زخمی ہونے کے بعد وہ بیہوش ہو گئی تھی۔ ہوش تو تھوڑی دیر کے بعد آ گیا تھا لیکن پھر پلنگ سے نہ اٹھ سکی … ہسپتال ہونے کا اندازہ کیا … لیکن ابھی تک … کمزور ہو چکی

تھیں کہ ڈاکٹر دلاور نے کسی طرح بھی یہ مناسب نہ سمجھا کہ ہسپتال جا کر رشیدہ کا حال دیکھ کر اور درد مول لاتے۔ نوشابہ دن رات ماں کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی اس نے کالج جانا بھی فی الحال ملتوی کر دیا تھا۔ ظہیر دل و جان سے اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ لاکھ لاکھ منتیں کرتی۔ مگر نوشابہ نے تو آرام کرنے کی قسم کھا لی تھی۔ حسینہ اس کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتیں اور اصرار کر کے اسے واپس اپنے کمرہ میں بھیجتیں۔ لیکن وہ سونے کا نام نہ لیتی۔ زیادہ اصرار کرنے پر وہ رونے لگتی۔ رشیدہ کو اگرچہ کوئی منہ نہ لگاتا تھا۔ حسینہ اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتیں، نوشابہ کی تیوریاں چڑھ جاتیں حد یہ ہے کہ ماؤں کی چوتی شہزادی تک منا دعوی نظروں سے انہیں دیکھتی۔ وہ یہ زہریلی نگاہیں دیکھتیں، مگر چپ رہتیں، انتہائی پابندی کے ساتھ صبح اور شام آتیں۔ تھوڑے تھوڑے دو چار باتیں کرتیں، کسی بات کا جواب نہ ملتا، پھر واپس چلی جاتیں، کبھی بے غرض بن کر بیٹھ جاتیں، لیکن کوئی رخ نہ کرتا۔ ہلکی ہلکی جمائیاں لیتی رہتی اور پھر گھر کے سننے بغیر واپس آ جاتیں۔ نہ کوئی یہ پوچھتا کیوں آئیں! نہ کوئی یہ عذر کرتا کہ کیوں گئیں، بظاہر حسینہ کو کوئی خاص بیماری نہیں تھی سوائے کمزوری کے۔ لیکن یہ کمزوری جان لے لیتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب گو حسینہ کی دیکھ بھال اور تیمارداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ مگر علاج ڈاکٹر یسین کا ہو رہا تھا اور یہ ڈاکٹروں، حکیموں کا عام معمول ہے کہ کسی عزیز کا علاج اعتماداً وہ خود نہیں کرتے، پیشہ ور دوسرے سے علاج کرواتے تھے۔ وہ بار بار نسخے بدلتے تھے۔ بہتر سے بہتر دوائیں دیتے تھے۔ لیکن مریضہ کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ انہیں تو حیرت تھی۔ اور ڈاکٹر دلاور تو پریشان تھے کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے، دوائیں کیوں بے اثر ثابت ہو رہی ہیں

ہاں سے آتی ہیں اور لانے والے رشیدہ کے شوہر تھے۔ "یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس میں کچھ گڑبڑ ہو سکتی ہے۔"

لیکن ساری گڑبڑ اسی میں پوشیدہ تھی کہ دوائیں رشیدہ کے میاں لاتے تھے۔ اور انہوں نے اپنی وفادار بیوی سے مشورہ کر کے یہ طے کر لیا تھا۔ کہ جلد از جلد حسینہ کو اس دنیا سے رخصت ہو جانا چاہیئے۔ رشیدہ نے اس فیصلہ پر بڑی مشکل سے صاد کیا تھا۔ کیونکہ احسان کرنے والی اور محبت کرنے والی بہن کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی تھی اور دل ڈانواڈول ہونے لگتا تھا۔ لیکن ماں کی مامتا بہن کی محبت پر غالب آ گئی۔ اس کا خیال یقینی تھا اگر حسینہ زندہ رہیں تو پھر خالد کی خیر نہیں! اسے پھانسی پر لٹکنا پڑے گا۔ مرنا نہ بھی پڑا تو بھی اس کی زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی۔ نوشابہ سے اس کی شادی نہ ہو سکے گی، اس گھر کو چھوڑنا پڑے گا، ڈاکٹر صاحب چاہے کچھ نہ کہیں، لیکن حسینہ بستر علالت سے اٹھنے کے بعد پہلا کام یہ کریں گی کہ خالد کو قانون کے حوالے کر دیں۔ کیونکہ بستر پر لیٹے لیٹے اپنی کمزور اور نحیف آواز میں وہ کئی مرتبہ اس عزم و ارادے کا اظہار کر چکی ہیں یہی وجہ تھی کہ اس حادثے کے بعد سے خالد روپوش تھا یا پھر کم از کم اس گھر کے دروازے اس پر بند ہو چکے تھے۔ کئی واسطوں سے اس کی خیریت رشیدہ تک دبے پاؤں چوری چوری پہنچتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی صورت دیکھنے کو ترس رہی تھی۔ لیکن بیٹا عزیز ہونے کے باوجود ان کی آنکھوں سے اوجھل تھا! وہ برابر اسے نوٹ اور روپے کبھی کبھی مزے دار کھانے بھی مختلف واسطوں سے بھیجا کرتی تھیں۔ لیکن دل خراب کی تسلی پھر بھی نہ ہوتی تھی۔ وہ تو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور

ان کا اثر ورسوخ تھا کہ یہ حادثہ پولیس کیس نہیں بنا اور ایک اتفاقی حادثہ کی صورت میں یہ واقعہ دب گیا، لیکن یقینی تھا کہ حسینہ بیگم تندرست ہونے کے بعد اس اتفاقی حادثہ کو جنون کا رقص ... سمجھیں گی۔ ڈاکٹر صاحب یہ نہیں جانتے تھے کہ شاید مر جائے۔ بہرحال مرحوم میں کا ... تھا۔ لیکن حادثے سے بہت پہلے رشیدہ نے اپنی باتوں کا جو زہر شربت اور شہد کی طرح گھول گھول کر انہیں پلایا تھا وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ شہزادی کی نالائقی اور بدچلنی سے وہ بہت بیزار تھے اور خالد سے بس انتہائی اقدام کر جو پستول کی صورت میں ظاہر ہوا وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ پھر اس کی عزت، اپنائیت اور وفاداری کے وہ دل سے معترف تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ اس کا بال بھی بیکا ہو۔ حسینہ بیگم سے گفتگو کا ابھی تک انہیں موقعہ نہیں ملا تھا؛ اس نے تصویر کا دوسرا رخ سامنے رکھا تھا۔ جو بڑی شرمندگی کے ساتھ رشیدہ نے ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اور رشیدہ کا جب آمنا سامنا ہوتا اس کی آنکھیں پرنم نظر آتیں۔ وہ کچھ پوچھنے کی کوشش کرتے تو جواب دینے کے بجائے وہ رونے لگتی۔ وہ تسلی اور دلدہی کی باتیں کرتے تو ہچکیاں بن جاتیں اور سسکیوں کے زور سے سارا بدن بید لرزاں کی طرح ہلنے لگتا۔ بے چارے کا دل بہت کڑھتا کہ بہن کے لئے جان دینے والی ہے کہیں ایسا نہ ہو حسینہ سے پہلے یہ دنیا سے سدھار جائے۔ کسی بہن کی روح پرور محبت کے مناظر ان کی نگاہوں نے کم دیکھے تھے، بلکہ بالکل نہیں دیکھے تھے۔"

رشیدہ کی ہچکی جاری تھی، ... کر دوا ... جو ... کا ... ا

اور آ ... سابقہ ... چپقلش اور ... کی بدمزاجی اور بے اتفاقی کے باوجود اخلاق کا اظہار، حسینہ کی طرف سے پرستش نہ ہونے کے باوجود اس پر صدقے قربان ہونے کا سلسلہ، شہزادی کی کسی کسی وقت کی گستاخی اور مستقل سرکشی کے باوجود اس تک سے ریشم کی طرح نرم اور مخمل کی طرح ملائم برتاؤ ڈاکٹر صاحب نے ... ہی کا خاتمہ کر دیا اور آہیں بھرنا!

بعض زہر ہوتے ہیں جو اتنے قاتل ہوتے ہیں کہ چند لمحوں میں فیصلہ کر دیتے ہیں، بعض قاتل تو ہوتے ہیں لیکن اثر غیر محسوس طور پر آہستہ آہستہ کرتے ہیں۔ رشیدہ نے اسی طرح کا زہر حسینہ کو دیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنا کام کر رہا تھا۔ وہ گھلتی جا رہی تھی۔ نڈھال ہوتی جا رہی تھی۔ موت سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دن موت اس کے پاس پہنچ گئی۔ دم اکھڑ چکا تھا، چہرے پر مردنی چھا گئی۔ سب سے پہلے اس نازک صورت حال کا احساس رشیدہ کو ہوا۔ اس نے روتے ہوئے شہزادی سے کہا:

"خدا کے لئے جلدی سے بھائی صاحب کو بلاؤ!"

پھر قرآن لے کر بہن کے سرہانے سورۂ یٰسین کی تلاوت کرنے لگی۔ آنسوؤں کا تار جاری تھا، لیکن وہ بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ یٰسین پڑھے جا رہی تھی تاکہ نزع کی تکلیف کم ہو اور جان جلدی سے اور آسانی سے نکل جائے۔ ڈاکٹر صاحب فوراً دوڑے دوڑے آئے۔ حسینہ کا یہ آخری وقت تھا۔ اس کی نظر شاید پتھرا چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے بے قرار ہو کر پکارا

"حسینہ!"

... ڈاکٹر ... ابھی ... گئی اور ... کر ...

بند ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب پچھاڑ کھا کر گر پڑے۔ بے اختیار بے ہوش ہو گئی۔ شہزادی ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔ رشیدہ نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، بال نوچ لیے اور نالہ و بکا کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مرنے والی مر گئی۔۔۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ!



# انقلاب

حسینہ کی جیسے ہی آنکھیں بند ہوئیں، سارا گھر ایک بہت بڑے انقلاب کی زد میں آ گیا۔

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت

ڈاکٹر صاحب ویسے ہی ٹوٹ چکے تھے، اس حادثے نے ان کی کمر توڑ دی۔ گھر میں تو آنا جانا انہوں نے ترک کر دیا۔ گھر میں آتے تو حسینہ کی یاد بھی ساتھ آتی۔ وہ یہاں بیٹھا کرتی تھی، یہاں رہا کرتی تھی، یہ اس کا کمرہ ہے۔ یہ اس کی چیزیں ہیں، یہ اس کی مسہری ہے، یہ اس کا بستر ہے، یہ اس کے کپڑے ہیں۔ یہ سب چیزیں اور کیفیتیں کر کے ڈاکٹر صاحب کو نظر آتیں اور محسوس ہوتیں۔ علیم ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ سارا گھر گھوم رہا ہے، وہ بھی گھوم رہے ہیں اور سب اب چکر کھا کر گرنے ہی والے ہیں اور سب سے زیادہ دل دوز حالت تو نوشابہ کی تھی۔ اس کا حال زار دیکھ کر دل کو قابو میں رکھنا بڑے دل گردے والے آدمی

سا کام تھا۔ اماں کا جب سے انتقال ہوا تھا اسے چپ لگ گئی تھی۔ شہزادی گھنٹوں اور پہروں اس کے پاس بیٹھتی۔ اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتی۔ اسے لطیفے سناتی، کہانیاں سناتی، لیکن نہ اس کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوتا، نہ اس کے چہرے بشرے سے خوشی اور مسرت کا اظہار ہوتا۔ جس طرح ڈاکٹر صاحب نے باہر سے اندر آنا تقریباً چھوڑ دیا تھا، اسی طرح نوشابہ نے اپنے کمرے سے باہر نکلنے کی قسم کھالی تھی۔ بس یا کتابیں پڑھا کرتی یا کارچوبی کاڑھتی یا چپ چاپ بیٹھی رویا کرتی۔"

گھر کا سارا چارج خود بخود رشیدہ کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ سارے گھر کی وہی تنہا مالک و مختار تھی۔ نوکر اور ملازم اب براہ راست ان کے ماتحت اور تابعدار تھے۔ ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ سارا انتظام اور بندوبست انہی کے ہاتھ میں تھا۔ کھانا انہی کی نگرانی میں اور انہی کی پسند سے پکتا۔ وہ خود ہی باورچی خانے میں جا کر اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتیں۔ ایک خوان میں لگ کر ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں جاتا۔ دوسرے خوان میں نوشابہ کے کمرہ میں بھیج دیا جاتا۔ ڈاکٹر صاحب تو کھانے پر مجبور تھے، کیونکہ کھانا بھیجتی رشیدہ بھی بھائی صاحب کے کمرے میں پہنچ جاتی اور اصرار کر کے انہیں کھانا کھلاتی۔ رشیدہ کی اس سعادت مندی، خدمت اور ایثار سے ڈاکٹر صاحب اتنے متاثر تھے کہ دل ہی دل میں اس کی شرافت اور بلندی کردار کا کلمہ پڑھنے لگے تھے۔ رہی نوشابہ تو شہزادی نے بہت اصرار کیا دو چار لقمے زہر مار کر لیتی کبھی خوش ہو کر نہیں، کھانے سے بدی جوں کی توں ویسے کے ویسے واپس کر دی۔۔۔

دن اسی طرح گزر رہے تھے اور آئندہ کیسا زمانہ آنے والا تھا، اسے



کون جانتا تھا۔"

خالد نے ابھی تک اعلانیہ تو گھر میں آنا جانا نہیں شروع کیا تھا، لیکن ویسے اب وہ آنے لگا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی نظر بچا کر اور نوشابہ سے چھپتا ہوا جب اس کا جی چاہتا پہنچ جاتا اور گھنٹوں رشیدہ، نوشابہ کی اس آمد و رفت کی ٹن گن شہزادی سے مل گئی تھی، لیکن وہ بدستور انجان بنی رہتی۔ وہ اب تک اپنی حیثیت متعین نہیں کر سکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے آنا جانا تقریباً ترک کر دیا تھا۔ اگر کوئی ضرورت ہوتی تو رشیدہ خود دروازے میں پردہ کرا کے جاتیں اور بات چیت کر آتیں۔ کبھی کبھی جب بیٹی کی یاد ستاتی تو ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر کے لئے نوشابہ کے کمرے میں آ جاتے۔ ان کے پیچھے ہی سایہ کی طرح رشیدہ بھی پہنچ جاتی۔ ڈاکٹر صاحب کچھ دیر بیٹھے بیٹی سے تسلی اور دلدہی کی باتیں کرتے۔ وہ زیادہ تر خاموش رہتی۔ کبھی کالج کی فیس یا کتابوں کے بارے میں کہہ دیتی، وہ منہ مانگے روپے اپنی بھتیجی بی کو دینے کی تاکید . . . رشیدہ کو کر دیتے کیونکہ گھر کا سارا حساب کتاب اور خرچ رشیدہ ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بھانجی کی بلائیں لے کر کہتی۔ "بھائی صاحب! آپ دنیا کے ہر معاملہ میں دخل دیجئے، لیکن میرے اور میری بچی (نوشابہ) کے معاملہ میں دخل نہ دیجئے۔ آخر آپ اس سے کیوں پوچھتے ہیں؟ دیتی کوئی ضرورت تو نہیں ہے؟ بچی کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ یہ میرا کام ہے۔ میں اپنی بچی کی ماں ہوں۔ اس کی نظر پہچانتی ہوں۔ اور اس کی ہر خواہش پوری کر دیتی ہوں۔ کیوں میری بچی میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں؟"

# چالاکی

نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے رشیدہ نے ڈاکٹر صاحب کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔ حسینہ کی موت نے انہیں دنیا اور زندگی سے دل برداشتہ کر دیا تھا۔ وہ صرف نوشابہ کے لئے زندہ تھے۔ انہیں اب کوئی فکر تھی تو صرف یہ کہ جلد از جلد نوشابہ کی شادی کر کے اپنے سب سے بڑے اور آخری فرض سے سبک دوش ہو جائیں۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ نوشابہ کی شادی کر کے ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے جائیں گے۔ اور جب وقت آجائے وہیں موت کو لبیک کہیں۔ اب وہ جلد از جلد یہ فریضہ ادا کر دینا چاہتے تھے۔ خالد کی ہر سعادت مندی، اطاعت اور متانت نے انہیں اس کا گرویدہ کر لیا تھا۔ شروع شروع میں اس کی بدتمیزی اور گستاخی کی جو جھلک ان کے کان میں پڑی تھی اور جس نے انہیں دل ہی دل میں کسی حد تک خالد سے خفا کر دیا تھا اب وہ بالکل دور ہو چکی تھی اور اسے گذشتہ تازہ کردہ غلط فہمی سمجھ



محسوس کرنے لگے تھے۔ کیونکہ جو لڑکا بھیگی بلی بن کر سامنے آتے بزرگوں کے سامنے لب ہلانا گناہ سمجھتا ہو، جو اپنے ہاتھ سے ان کا حقہ بھرتا ہو، شہزادی اور سنزلی سے چھین کر خود دکھائے اور ناشتہ کا خوان لے جا کر ان کے سامنے رکھتا ہو، خود ان کے ہاتھ دھلاتا ہو۔ بھیگی لئے کر ادب سے سامنے کھڑا ہو جاتا ہو، نوشابہ اور شہزادی وغیرہ اسے لاکھ ایکٹنگ سمجھیں مگر سادہ لوح اور سادہ دل ڈاکٹر صاحب کے پاک صاف دل میں بھلا ایسا ناپاک خیال کس طرح آسکتا تھا؟ دل ہی دل میں وہ پسند کر چکے تھے کہ خالد سے بہتر نوشابہ کے لئے کوئی رفیق حیات مل نہیں سکتا۔ وہ منتظر صرف اس کے تھے کہ رشیدہ پیام دیں اور وہ منظور کر لیں۔ کسی وقت یہ خیال آتا کہ نوشابہ کا عندیہ لیں۔ کبھی سوچتے اس کی ضرورت ہی کیا ہے، بھلا وہ باپ کی مرضی اور انتخاب کے خلاف جا سکتی ہے۔ پھر خیال آتا، بہر حال زمانہ بدل گیا ہے۔ ایک ہی لڑکی ہے جو ان کا دل کا سہارا اور بڑھاپے کی آنکھوں کی روشنی ہے۔ لہٰذا اس کا عندیہ لے ہی لینا چاہئے۔ یہی سوچ کر آج انہوں نے تنویر کو بلایا تھا وہ سمجھ گئی ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ "مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام؟" بہرحال وہ فوراً پہنچی۔ ڈاکٹر صاحب حسب معمول تپاک اور گرمجوشی سے ملے۔ شکایت آمیز لہجے میں کہنے لگے۔

"تم نے تو شاید اس گھر میں نہ آنے کی قسم کھا لی ہے، خفا ہو کچھ؟"

تنویر بولی۔

"بھائی جان آپ جیسے آدمی سے خفا کون ہو سکتا ہے، رہا گھر میں آنے نہ آنے کا معاملہ۔ تو ویسے بھی گھر کی مصروفیتیں ایسا گھیرے رہتی ہیں کہ کب صبح ہوئی ہے، کب شام، اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔

انتقال ہوا ہے واقعی اس گھر میں آنے کے خیال سے کچھ ڈرتا ہے۔ نوشابہ خوبصورت نہیں دکھتی جاتی۔ اس لئے تو ماں کے غم کو زندگی کا سرمایہ بنا لیا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کو گفتگو شروع کرنے کا اچھا موقع مل گیا، فرمایا۔

"اسی لئے میں چاہتا ہوں، جلد از جلد نوشابہ کی شادی ہو جائے تو اور اس سے سبکدوش ہو کر ہجرت کر جاؤں۔"

وہ بولی۔

"نا خالو صاحب ایسا نہ کیجئے آپ بھی چلے جائیں گے تو واقعی نوشابہ رو کر جان دے دے گی۔ وہ اپنی ماں کو بہت چاہتی تھی۔ اور یہ محبت اب آپ کی طرف منتقل ہوئی ہے۔ اگر یہ سہارا بھی اس سے چھن جائے، تو ذرا سوچئے حشر ہوگا اس کا۔"

کچھ سوچتے ہوئے ڈاکٹر صاحب بولے،

"اچھا خیر نہ جاؤں گا۔ میرا ارادہ فوراً جانے کا نہیں ہے، کچھ عرصہ دیکھا جائے گا، لیکن شادی بہرحال ہو جانی چاہئے۔"

تنویر نے تائید کی۔

"جی بے شک! ۔ ۔ ۔ کوئی لڑکا ہے نظر میں؟"

ڈاکٹر صاحب نے حقہ کا ایک کش لگایا، اور خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

"وہ تو گھر ہی میں ہے ــــــ خالد!"

تنویر کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، لیکن اس نے اپنی کیفیت اور تعجب سے پوچھا

"کہاں؟ صاحب خالد؟"

نہایت اطمینان سے وہ بولے،



"ہاں بھئی خالد، کیا تم اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتیں؟"

وہ کہنے لگی،

"میں تو انہیں کچھ زیادہ جانتی نہیں، آپ کہتے ہیں تو واقعی اچھا ہوگا۔ لیکن نوشابہ کا عندیہ بھی تو لے لینا چاہئے۔ ماشاءاللہ جوان ہے اور تعلیم یافتہ لڑکی ہے اور چونکہ ماں باپ کے انتہائی لاڈ سے پلی ہے۔ اس لئے حساس بھی بہت زیادہ ہے۔"

ڈاکٹر صاحب مسکرائے،

"ہاں بھئی تنویر اسی لئے تو تمہیں بلایا ہے۔ اگرچہ یقین ہے کہ نوشابہ میری رائے اور انتخاب کو رد نہیں کر سکتی، پھر بھی احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ اس سے رائے لی جائے اور یہ کام تم سے بہتر کوئی اور نہیں کر سکتا۔ تم اس کی مزاج شناس ہو۔ اس کا دل ٹٹولو اور اگر اسے کچھ متامل دیکھو تو سمجھاؤ کہ بہترین انتخاب ہے۔"

تنویر نے کہا

"نہیں خالو صاحب میں اس سلسلہ میں کوئی ذمہ داری نہیں لے سکتی یعنی خالد یا رشیدہ کے ایجنٹ کی حیثیت سے کوئی بات نہیں کر سکتی۔ ہاں اس کا عندیہ ضرور لوں گی اور مجھے یقین ہے اپنے دل کی بات وہ مجھ سے نہیں چھپائے گی۔ جو اس کا عندیہ ہوگا من وعن آپ سے بیان کر دوں گی، پھر آپ جانیں اور بیٹی، میں بیچ میں بولنے والی کون؟"

"ہاں ٹھیک ہے، ــــــ تم اس کا عندیہ لے کر مجھے بتاؤ، پھر میں کوئی آخری فیصلہ کروں گا۔ ویسے ابھی تک رشیدہ نے باقاعدہ پیغام نہیں دیا ہے۔"

تنویر ٹھٹک گئی،

"یہ تو نہ کہئے بھائی صاحب۔ رشیدہ بڑی سمجھدار ہے، وہ کبھی پیام نہیں دے گی۔ وہ حالات ایسے پیدا کر دے گی کہ آپ خود ایک دن خالد اور نوشابہ کو سامنے بٹھا کر قاضی صاحب کو بلائیں گے اور دو بول پڑھا دیں گے۔"

ڈاکٹر صاحب ہنسنے لگے۔

"بھئی تنویر، تم تو بہت خفا ہو بے چاری رشیدہ سے، حالانکہ وہ ہمیشہ تمہاری تعریف کرتی رہتی ہے۔"

تنویر نے بحث کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے روکا۔

"کہاں چلیں؟ ابھی تم سے ایک اور ضروری بات کہنی ہے!"

وہ کھڑے کھڑے بولی،

"فرمائیے سن رہی ہوں!"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

"شاہد اب بالکل اچھا ہو گیا ہے۔ آج ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ اس کا اب اس گھر میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں اسے اپنے ہاں رکھ لو۔ مصارف میرے ذمہ!"

تنویر کی تیوری چڑھ گئی!

"واہ بھائی صاحب واہ۔ آپ نے بھی اچھی کہی۔ میرا گھر کچھ بورڈنگ تو ہے نہیں، پھر شاید کوئی غیر ہے، وہ بھی میرا بچہ ہے۔ آپ اس کے مصارف دیں گے اور میں کیوں لوں گی؟ میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ اس گھر کے دروازے اس پر کیوں بند کئے جا رہے ہیں، بلکہ میں تو اس فیصلہ سے خوش ہوں کہ اس طرح میری دیرینہ حسرت پوری ہو گئی۔ میں تو شاہد کو مرنے



کے بعد ہی سے اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی، لیکن حسینہ بھابی کا حکم نہ ٹال سکی۔"

ڈاکٹر صاحب کے جواب کا انتظار کئے بغیر تنویر باہر نکل آئی اور نوشابہ کے کمرے میں چلی گئی۔

# پیکر یاس و حرماں

نوشابہ اپنے کمرے میں یاس و الم کی تصویر بنی بیٹھی تھی جب سے حسینہ کا انتقال ہوا تھا وہ جینا بھول گئی تھی۔ زندگی سے اسے نفرت ہو چکی تھی۔ رشیدہ کی چالبازیاں اور کی دھمکیاں وہ جو نشتر ہیں اسے اور زیادہ زندگی سے متنفر کر دیتی تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ ان خونخوار بھیڑیوں اور جاہلوں نے کیا کیا ستم کیا ہے۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا خواہ کچھ بھی ہو جائے ان لوگوں کی مرضی پوری نہیں ہو سکتی۔

وہ دیکھ رہی تھی کہ ڈاکٹر صاحب رفتہ رفتہ بالکل رشیدہ کے شکنجے میں کس چکے تھے۔ کسی بات پر جانا کرنے کے بعد بول کھول دے۔ رشیدہ اور ان کے زندان نما خانہ میں نہیں سوچتی تھی اس طرح بے ربطی اور بیزاری بڑھ جائے گی۔ شکر ہے بابا جان میری باتوں کا یقین کریں۔ دکھ میں اس وقت تو ان پر رشیدہ اور خالہ کا جادو چڑھا ہوا ہے۔



پھر یہ سوچتی میں کب تک۔ خاموش رہوں گی۔ کیا اس وقت بھی جب میرا سودا ہو رہا ہوگا؟"

اور اسے جواب دیتا۔

ایسا قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ میں فروخت نہیں ہو سکتی۔ اپنا سودا کرنے کی اجازت کسی کو نہیں دے سکتی ——— ابا جان کو بھی نہیں!"

اس خاموشی اور تنہائی کا اس کی صحت پر بہت برا اثر پڑ رہا تھا۔ چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ بدن لاغر ہو گیا تھا۔ اعصاب اتنے متاثر تھے کہ ذرا سی بات پر رونا آجاتا۔ لیکن ضبط کی خوگر تھی۔ کیا مجال جو منہ سے کلام نکلے اور خاموش رہتی۔

لیکن آج اس افسردگی اور غم و الم کے باوجود جس نے اس کی زندگی کو مستقل سوز و حسرت بنا دیا تھا کسی حد تک وہ خوش تھی۔

آج شاہد ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر واپس آ رہا تھا!"

شاہد!

شاہد کے تصور سے اس کی روح میں بالیدگی پیدا ہو جاتی۔"

شاہد کے ساتھ ساتھ خود بخود اس کی نگاہ تصور کے سامنے خالد آ جاتا۔

ایک شیطانی مجسم۔ دوسرا فرشتہ رحمت۔ ایک سراپا خباثت، دوسرا پیکر شرافت۔ ایک کی آنکھوں میں حرص اور بد معاشی کے شعلے رقص کرتے رہتے تھے اور دوسرے کی آنکھوں سے حیا، انسانیت، شرافت کا نور جھلکا دیتا تھا

کتنا فرق تھا ان دونوں میں۔؟

وہی فرق جو سیاہی اور سفیدی میں ہوتا ہے۔ نور اور ظلمت میں ہوتا ہے
انسان اور شیطان میں ہوتا ہے۔؟

شیطان مجسم اس کو مستقل نظر میں تھا۔ گو وہ اسے منہ نہیں لگاتی تھی،
لیکن وہ [illegible] سے گیا مگر کیا پھر اپکڑی سے گیا، گو وہ اسے دعوت نہیں
دیتی تھی۔ لیکن کبھی نہ کبھی بہانے سے کوئی نہ کوئی ضرورت پیدا کرکے کسی نہ کسی طرح
اپنی جھلک دکھا ہی جاتا تھا۔ دراصل وہ دیکھ کر اس کی باتیں سن کر اس کی روح
تحلیل ہو جاتی تھی!

اور وہ فرشتہ رحمت ہے جو انسانیت کی شان اور شرافت کی
آن ہے۔ ہسپتال میں، موت بیمار کے ہاتھوں زندگی اور موت اور زیست کی
کشمکش میں گرفتار ہے، اس کا جسم اس کے بس میں نہیں، کروٹ تک نہیں لے سکتا۔

یا اللہ کیا یہی انصاف ہے۔؟

کہ تیری اس دنیا میں، نیکوں کے ساتھ، اچھوں کے ساتھ یہی سلوک
ہوتا ہے؟

آخر شاہد کس بیرحمی کے عالم میں کیوں ہے۔ وہ خالد جیسی کی بسری کیوں
بجا رہا ہے۔

یہ سوچتے سوچتے بھولی کے سامنے شاہد کی تصویر آگئی:
دل آویز دلفریب۔ کشش انگیز حسن مردانہ کا نمونہ، جلال و جمال کا
دلکش امتزاج، کمزوروں کا دوست، ستم رسیدہ کا حامی۔!

آج وہ آ رہا ہے۔ آج وہ آ جائے گا۔ آج بھولی ولاسے میں بہار
آ جائے گی۔"



کتنی اکتا گئی ہوں اس تنہائی سے ــــــ کوئی ہمدم ہے، نہ
دمساز، دلنواز ہے، نہ ہم سخن۔!

لیکن کیا اس کے آ جانے کے بعد بھی میری یہی حالت رہے گی؟

نہیں ــــ اس کے آتے ہی میں بدل جاؤں گی، وہ مجھے افسردہ
نہیں دیکھ سکتا، وہ مجھے ملول اور غمگین نہیں دیکھ سکتا۔ وہ میرا سوگ، میرا غم
میرا صدمہ، کبھی اور کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ آتے ہی آ جائے گا اور مجھے ہنسانے
لگا، مجھ سے باتیں کرے گا۔ مجھے اپنے پڑھے ہوئے اور سب سنے ہوئے
افسانے سنائے گا۔ لطیفے سنائے گا۔!

اس کے آتے ہی کایا پلٹ جائے گی۔

لیکن رشیدہ خالہ کا سلوک اس کے ساتھ کیسا ہوگا؟

خالہ وہی جو اس کے آنے کے بعد آپے میں رہے گی؟

زبان اس کا مقام اس طرح برداشت کر لیں گے؟

شاید کچھ نہیں ہو سکے گا۔؟

رشیدہ خالہ اسے دیکھتے ہی جن کے آنسو رو دینے لگیں گی، بس چلے تو زہر
دے کر ہلاک کر دیں، بس چلے تو گلا گھونٹ دیں، بلکہ شاید اسے ٹکڑے
ٹکڑے کر دیں!

اور خالد صاحب!؟ ــــــ وہ تو اسے دیکھتے ہی جل بھن کر کباب
ہو جائیں گے، شاید ایک مرتبہ پھر پستول لے کر سامنے آ جائیں۔ اور پھر ستم
کی جرأت پھر کر گزریں ــــ لیکن نہیں وہ بزدل ہے، اور گولی بزدل
سا ہے اگر نشانہ بن سکا۔ وہ تو پیچھے سے حملہ کرتا ہے اس کے بعد ... [illegible]
[illegible]

ثابت ہوگا۔ تو نے کا جہاں جانے گا وہ زبردست طمانچہ جو اس نے خالد
صاحب کے رخسار پر رسید کیا تھا، آج تک یادگار ہے اور شاید
زندگی بھر یاد رہے گا!"

"اور ابا جان؟"

"مجھے تو ان معاملات جیت کا کم موقع ملتا ہے، بہت کم، امی کی وجہ سے
میری کم گوئی۔ مجھ ابا جان پر ہر وقت رشیدہ خالہ کا تسلط رہنا۔
ان کا رد عمل کیا ہوگا شاہد کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم!"

"لیکن معلوم کیسے نہیں، بے چاری شہزادی بس رہی تو نعمت تھی میں
میری ہمدرد، جان نثار دوست تھی۔ وہ نہ ملتی تو شاید میں اس دنیا سے
رخصت ہو چکی ہوتی۔ وہی تو ہے جو ہر وقت سایہ کی طرح میرے ساتھ لگی رہتی
ہے۔ مجھے روتے نہیں دیکھ سکتی، مجھے پریشان نہیں دیکھ سکتی، میری آنکھوں میں
آنسو نہیں برداشت کر سکتی اور اس نے رشیدہ خالہ سے اپنی بہن اور امی
کے بے بس بھی ہیں اور جہاں تک ابا جان کا تعلق ہے وہ بھی رشیدہ خالہ کی
ہر وقت کی چخ چخ کے باوجود اس کی وضعداری اور جان نثاری کے قائل
ہیں۔ ورنہ غریب کب کی نکال دی گئی ہوتی اس گھر سے ——— ہاں تو
وہ بتا رہی تھی کہ

"صاحب کے خیالات شاید تمہاری طرف سے اچھے نہیں ہیں ان کا نام
سن کر ان کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں۔ خفا سے ہو جاتے ہیں، ایسا لگتا
ہے جیسے غصہ آ گیا ہو!"

"مجھ سے کہہ رہی تھی،
تم سجاد صاحب کو ——— آخر وہ کیوں اس سے خفا ہیں!"

میں خاموش ہو رہی، جواب نہ دے سکی۔ کیا کہتی جواب میں!

یہ باتیں اس وقت تھیں جب تک شاہد ہسپتال میں تھا۔ آج
انشاء اللہ وہ آ جائے گا اور اس کے آنے کے بعد جو بھی اس کے خلاف ہوگا
اسے مجھ سے لڑنا پڑے گا ——— چاہے وہ ابا جان ہی کیوں
نہ ہوں!"

"ہاں میں ان سے بھی لڑ جاؤں گی!
سارا ماجرہ بیان کر دوں گی، وہ مجھے بہت چاہتے ہیں۔ وہ مجھے جھوٹا
نہیں سمجھتے ان کے سامنے میں نے خالہ کی پول کھول دی اور شاہد کا حال
بیان کیا تو حالات نیا رخ اختیار کریں گے ——— انجام خواہ کچھ ہی
کیوں نہ ہو۔ نمٹ لوں گی ——— کچھ!"

## اور دفعتہً

نوشابہ ابھی کچھ سوچ رہی تھی کہ اسے آہٹ سی محسوس ہوئی، نظر اٹھا کر دیکھا تو تنویر کھڑی تھی۔

تنویر کو دیکھ کر نوشابہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ادب سے سلام کر کے اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ تنویر نے دعا دی اور اسے گلے سے لگا لیا۔

نہ جانے کیوں دونوں کی آنکھیں پھوٹ نکلیں۔

نوشابہ نے کہا: "اب آئی ہیں آپ ـــــــــ کیوں آئیں، میں بھی مر جاتی تب آتیں۔"

تنویر نے چشم پر آب سے اسے دیکھا۔ اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میری بچی تیرا شکوہ سر آنکھوں پر، خدا جانتا ہے کتنی محبت ہے میرے دل میں۔ جی چاہتا ہے اگر رہ جاؤں تیرے پاس مت کر چھوڑ چھاڑ کے پھر چلی آئے، کیا روکا ہے کسی نے؟"



وہ بولی،

"ہاں ـــــــــ روکا ہے، ورنہ میں اگر بھائی صاحب نہ روکتے تو آ گئی۔"

نوشابہ نے سوال کیا۔

"کس نے روکا ہے آپ کو؟ کون ہے جو روک سکے آپ کو؟"

وہ ایک ٹھنڈا سانس لے کر بولیں،

"وہ صرف ایک ہستی ہے ـــــ رشیدہ۔"

بے یقینی کے لہجہ میں نوشابہ نے کہا،

"یہ نہیں ہو سکتا، میں آپ کی بات کا اعتبار نہیں کر سکتی۔ بے شک وہ آپ سے جلتی ہیں، لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں کہ اس گھر میں آنے سے آپ کو روک سکیں، ابا جان لاکھ ان کے پھندے میں گرفتار ہوں، لیکن آپ کے خلاف ایک لفظ بھی اگر سن لیں تو اسی وقت بھڑک اٹھیں گے اور اس بات کو وہ بھی جانتی ہیں۔"

تنویر نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔

"سچ کہتی ہو، واقعی رشیدہ کی اتنی مجال نہیں، لیکن بیٹی مجھے خود ہی تو اس سے نفرت ہے۔ اس کی صورت کو دیکھتی ہوں تو خون کھولنے لگتا ہے۔ اس کی باتیں سنتی ہوں تو حسرت ہوتی ہے کاش بہری ہو گئی ہوتی۔ بھلا اس گھر میں اس کا عمل دخل ہو، دیکھ کر بار بار کیسے برداشت کر سکتی ہے ۔۔۔ توبہ کرو!"

نوشابہ نے جھینپ کر کان پکڑ لئے اور ایک ادا کے ساتھ کہا۔

"اچھا توبہ کر لی، مگر پھر آپ کیسے گئیں؟"

وہ کہنے لگی :

"کہہ تو رہی ہوں بھئی ۔۔۔۔۔ میں جو ذرا کی کہیں لالی گئی ہوں! بھائی صاحب نے بلوایا تو مجبوراً آنا پڑا ، ورنہ دیر کیے تھی ہوں ، تھوڑی دیر میں چلی جاؤں گی!"

حسینہ کے مرنے کے بعد سے آج پہلی مرتبہ نوشابہ کے دل میں تنویر کو دیکھ کر خوشی کی لہریں اٹھیں تھیں ، لیکن یہ سن کر کہ وہ ابھی واپس چلی جائے گی وہ افسردہ ہو گئی ، اس نے کہا ،

"میں تو نہیں جانے دوں گی آج آپ کو کسی طرح ،"
دیکھو مجھے لگا

تنویر نے محبت کے جوش سے بے تابو ہو کر اسے کھینچ کر کلیجے سے لگا لیا اور پیار کرتی ہوئی بولی :

"میری زبان ، بھلا تیری ضد اور میں نہ پوری کردوں ، لیکن میری بھی ضد نہ کرو پھر کبھی آجاؤں گی ذرا اس منحوس رشیدہ کی صورت ، اور سیرت سے کسی حد تک مانوس تو ہو لوں :"

نوشابہ کو ہنسی آ گئی اور خود تنویر بھی ہنسی نہ روک سکی!

نوشابہ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا :

"لیکن آج آپ کی طلبی ہوئی کس طرح؟"

تنویر کو گفتگو چھیڑنے کا موقع مل گیا ، لیکن اس نے سوچا ، ایسی اہم اور تہلکہ خیز خبر دفعتاً نہیں سنانی چاہیے ، وہ اچھی طرح جانتی تھی ، نوشابہ کو جواب کیا ہو گا ، لہٰذا اس نے سوچا پہلے اسے ادھر ادھر کی باتوں میں الجھا کر پھر اصل بحث چھیڑوں ، کہنے لگی :

"یہ تو کیا وہ میرے بھائی نہیں ہیں؟"

"کیوں نہیں ہیں؟"

"پھر آخر انہوں نے بلایا تو حیرت کیوں کر رہی ہو؟"

"وہ گویا ہوئی ۔"

"حیرت اس پر نہیں کر رہی ہوں کہ انہوں نے بلایا کیوں ، اس پر کر رہی ہوں کہ اتنے دنوں کے بعد یاد کیسے آئی ؟ کہیں کوئی خاص بات تو نہیں؟"

تنویر کا دل دھڑکنے لگا کہیں یہ ذہین لڑکی کچھ تو نہیں گئی سب کچھ ، اس نے بات کو ٹال جانے کے لئے کہا

"کیا ہو سکتی ہے وہ خاص بات ۔۔۔۔۔ ذرا میں بھی تو سنوں؟"

نوشابہ نے مسکراتے ہوئے کہا ،

"بات کیا ہو سکتی ہے ، بس وہی ، جیسے مرزا غالب نے کہا ہے یعنی ،

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں!"

تنویر سن سی ہو گئی ، اسے یقین ہو گیا ، ضرور اس لڑکی نے کچھ بھانپ لیا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے ، لیکن کس طرح؟

اور اگر یہی بات ہے تو میں یہ بات کس طرح ادا کروں گی؟

کہیں یہ مجھ ہی سے خفا نہ ہو جائے ،

تنویر نے بات بناتے ہوئے کہا ،

"اچھا تمہارے یہ خیالات ہیں بھائی صاحب کے لئے ۔۔۔؟"
ابھی جا کر کہتی ہوں ان سے ، سنیے ، صاحبزادی کیا فرما رہی ہیں!

نوشابہ بولی :

"وہ جانے کیا دیکھے، وہ یقین ہی نہیں کر سکتے میرے بارے میں کہ ایسی بات نکل سکتی ہے میرے منہ سے ان کے لئے؟"

تنویر نے تیوری چڑھا کر کہا

"تو کیا میں چھچھوری ہوں؟"

وہ کہنے لگی،

"بالکل نہیں ــــ آپ بالکل ٹھیک ہیں لیکن صرف میرے سامنے ــــ ابا کی موجودگی میں نہیں"

تنویر نے پوچھا،

"وہ کیسے؟"

نوشابہ نے بتایا!

"مجھ سے پوچھیے تو اقرار کروں گی ہاں کہا تھا میں نے، ابا کی موجودگی میں یہی سوال کیجئے تو صاف انکار کر دوں گی!"

تنویر کو ہنسی آ گئی۔ کہنے لگی،

"بڑی تیز ہو گئی ہے اچھی تو۔ ــــ کو تو بڑی بھولی تھی یہ باتیں کہاں سے سیکھ لیں تو نے؟"

نوشابہ نے اسی طرح دل آویز تبسم کے ساتھ جواب دیا،

"ذہانت سیکھنے سے نہیں آتی، وہ تو خدا کا عطیہ ہے۔ جسے مل جائے"

تنویر کو لاجواب ہی ہو گئی؛

"اچھا تو بڑا زعم ہے آپ کو اپنی ذہانت اور فراست پر؟"

وہ کہنے لگی،

"بہت بڑا تو نہیں لیکن ہاں کسی حد تک ــــ بس یوں ہی سا"



اس بے ساختہ جواب پر ایک مرتبہ پھر تنویر ہنس پڑی، کہنے لگی،

"ارے تو حرفوں میں اڑانے لگی ہے تو بزرگوں کو ــــ لیکن بزرگوں کو بھی؟"

نوشابہ اس سے لپٹ گئی۔

"کیا خفا ہو گئیں آپ؟ ــــ معاف کر دیجئے"

تنویر نے اسے گلے سے لگایا اور بولی،

"تجھ سے خفا ہو سکتی ہوں پگلی؟"

# اور آخر کار

لیکن اب تنویر نے بات شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سوچا عالی صاحب انتظار کر رہے ہوں گے کہ میں کیا جواب لاتی ہوں،
کہیں خود نہ چلے آئیں۔"

آخر اس نے سلسلۂ گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا،

"یہ بھی سن لو عالی صاحب نے کچھ پیغام دیا ہے اس خاکسار کو۔"

وہ بے پروائی کے ساتھ بولی،

"کوئی خاص بات ہے،" کہا،

تنویر نے رازدارانہ الفاظ میں کہا،

"ہاں خاص ہی ہے ——— بلکہ خاص الخاص۔"

نوشابہ کو کچھ دلچسپی سی محسوس ہونے لگی۔

نوشابہ نے کہا "پھر سہیلیاں کچھ [illegible] ہیں۔"



تنویر نے کچھ توقف کے بعد کہا،

"وہ چاہتے ہیں تمہاری شادی جلد از جلد ہو جائے۔"

شادی کا نام سن کر نوشابہ چونکی،

"میری شادی؟"

وہ مذاق کرتی ہوئی بولی،

"اور کیا میری ——— وہ خدا رکھے شوہر کی موجودگی میں ...؟"

نوشابہ ہنستے ہوئے بولی۔

"واہ ——— مجھے بھی جو منہ میں آیا کہہ دیا، اگر کہیں یہ بات اڑ کر وہاں
پہنچ جائے تو؟"

وہ کہنے لگی،

"ہاں پہنچانے والا تمہارے سوا کون ہو سکتا ہے اور اگر تم نے
یہ حرکت کی تو تمہاری بھی پیروی کروں گی۔"

نوشابہ نے کہا،

تنویر: تم پوچھو گی تو کہہ دوں گی ہاں میری بچی سچ، ان کے سامنے
سوال آیا تو کہہ دوں گی عالی نے سب سے پہلے درخواست کی،

نوشابہ: (ہنستے ہوئے) کیا اتنی بدتمیز ہو کر ان سے اس طرح کی بات
کروں گی؟"

تنویر: کبھی تم تو بڑی سعادت مند ہو! ابھی امتحان ہوا جاتا ہے تمہاری
سعادت مندی کا۔ مجھے عالی صاحب نے تمہارا عندیہ لینے کو ..."

نوشابہ: (سنجیدہ ہو کر) کیا واقعی؟

تنویر: ہاں بالکل سچ۔

نوشابہ: میں نے یہ بات آج تک سوچی بھی نہیں تھی۔

تنویر: لڑکیاں، کم از کم اچھی لڑکیاں یہ بات سوچا بھی نہیں کرتیں۔ یہ کام تو ماں باپ کا ہوتا ہے۔ اب خدا کے فضل سے زندہ ہیں وہ۔ سوچ رہے ہیں اور ماں کے بجائے اللہ رکھے خالہ زندہ ہیں وہ سوچ رہی ہیں۔

نوشابہ: (تنگ آ کر) وہ کیا سوچ رہی تھیں؟

تنویر: یہی کہ جلد از جلد تمہیں اپنی بہو بنائیں اور اس طرح اپنی دیرینہ حسرت پوری کر لیں۔

نوشابہ: لیکن یہ حسرت میری زندگی میں تو پوری نہیں ہو سکتی کسی طرح۔

تنویر: یہ کیا بدتمیزی ہے۔ زندگی اور موت کا کیا سوال؟

نوشابہ: بالکل ہے ـــ خدا کی قسم زہر کھا لوں گی۔ مر جاؤں گی مگر یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتی کہ خالد جیسا تھیٹر پیا آوارہ، نکما، بدمعاش اور شیطان میرا رفیق حیات ہو۔

تنویر: کیا تم یہ جواب دے دو گی ـــ کچھ سوچا بھی؟

نوشابہ: (فیصلہ کن لہجہ میں) بہت اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ میں کوئی بات بھی بے سوچے سمجھے نہیں کرتی۔

تنویر: تمہیں بھائی صاحب نے سمجھا ہے

نوشابہ: کیا خالد کا وقت ملا کر۔

تنویر: ہاں ـــ ایسا ہی سمجھ لو۔

نوشابہ: تو میری طرف سے جواب ان کو بتا دیجئے۔

تنویر: کیا بتا دوں؟ یہی تو تیور ہیں



نوشابہ: صاف انکار!

تنویر: پھر سوچ لو!

نوشابہ: کہئے تو عمر بھر سوچتی رہوں لیکن جواب یہی ہو گا ـــ آج بھی، کل بھی اور ایک سو برس کے بعد بھی۔

تنویر: مجھے بھی تم سے اسی جواب کا اندیشہ تھا لیکن بھائی صاحب کہہ رہے تھے "اگر اس کو اس تجویز سے انکار ہو تو تم اسے سمجھا دو کہ یہ بہترین تجویز ہے، خالد سے اچھا شوہر اسے دنیا پر ڈھونڈ کر لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتا۔"

نوشابہ: ممکن ہے ان کے خیالات خالد کے بارے میں یہی ہوں لیکن میرے نہیں ہیں ـــ یہ صفات جو خالد کے انہوں نے بیان کئے ہیں، صرف ایک ہستی میں پائے جاتے ہیں۔

تنویر: (متحیر ہو کر) وہ کون سی ہستی ہے؟

نوشابہ: شاہد!

تنویر: (اطمینان کا سانس لے کر) گویا تو شاہد سے محبت کرتی ہے؟

نوشابہ: کیا کوئی شاہد جیسے فرشتے کو بھی نظر انداز کر سکتا ہے؟ کیا اس سے محبت کرنا ہر شخص کے لئے جو دولت کی چمک سے اندھا نہ ہو، عین فخر و ناز نہیں ہے؟

تنویر: میں نہیں سمجھتی تھی کہ تمہارے دل میں شاہد کی اتنی عزت ہے۔

نوشابہ: یہ میری بد قسمتی ہے ـــ لیکن آج تو سمجھ لیا آپ نے؟

تنویر: ہاں خوب اچھی طرح ـــ لیکن سوال یہ ہے کہ اب ہو گا کیا؟

نوشابہ: ہو گا کیا ـــ یہی کہ خالد صاحب منہ کی کھائیں گے۔

تنویر: اور شاہد بازی لے جائے گا!

نوشابہ: اگر اس نے چاہا۔

تنویر: لیکن ابھی کچھ بسنت کی خبر بھی ہے تمہیں!

نوشابہ: وہ خبر بھی سنا دیجئے، آج تو آپ نہ جانے کیسی کیسی خبریں لے کر آئی ہیں!

تنویر: لو تم سے خفا ہو گئیں بی بی تو!

نوشابہ: جی نہیں خفا تو میں کسی سے بھی نہیں ہوں اور آپ سے تو خفگی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا آپ تو صرف پرائی سن کر آئی ہیں۔

تنویر: ہاں اور کیا ـــــ لیکن تمہیں وہ بسنت کی خبر ہے کہ بھائی صاحب شاہد سے اتنے خفا ہیں کہ مجھ سے کہہ رہے تھے آج شاہد ہسپتال سے ڈسچارج ہو جائے گا لیکن میں اسے اپنے گھر میں رکھنا نہیں چاہتا تم اپنے ہاں رکھ لو، مصارف میں برداشت کر لوں گا۔

نوشابہ: (طنز سے) اور وہ اتنے بے غیرت ہیں کہ ان کے مصارف پر آپ کے ہاں چلے جائیں گے؟

تنویر: بھئی میں بھی اتنی بے غیرت نہیں ہوں کہ اس کے مصارف بھائی صاحب سے لوں گی ـــــ کیا وہ میرا لڑکا نہیں ہے؟

نوشابہ: لیکن ابا جان دفعتہً شاہد سے اتنے خفا کیوں ہو گئے؟ اماں کی زندگی تک تو یہ حال نہ تھا، انہیں معلوم ہے وہ شاہد شاہد کہتی مریں،

تنویر: اس کا سبب رشیدہ کے سوا کون ہو سکتا ہے؟ اس نے نہ جانے کیا کیا لگائی بجھائی کی ہوگی، آدمی کان کے کچے پہلے سے ...... ہیں۔ حمیدہ جیسی بہن ہی سے خفا ہو گئے تھے تو شاہد بے چارہ کیا چیز ہے۔

نوشابہ: معلوم ہوتا ہے اب مجھے میدان میں اترنا پڑے گا۔

تنویر: (پریشان ہو کر) بیٹی یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا ارادہ ہے تمہارا؟ بتاؤ تو سہی۔

نوشابہ: میں شاہد پر ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتی، میں اس کی توہین برداشت نہیں کر سکتی، میں ابا جان سے گفتگو کروں گی، اگر وہ عزت و احترام کے ساتھ اسے گھر میں نہ بلائے تو کھانا پینا چھوڑ دوں گی اور آپ میرے مزاج اور ضد کو جانتی ہیں۔

تنویر: (بے قرار ہو کر) نوشابہ ـــــ یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟

نوشابہ: یہی جو آپ نے سنا!

# انکشاف

اور ٹھیک اس وقت جب تنویر نوشابہ کے پاس پہنچی اس سے باتیں کر رہی تھی، شہزادی دبے پاؤں ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں پہنچی، اور بے حجاب جا کر کھڑی ہو گئی،

ڈاکٹر صاحب تنویر کا بے قراری اور بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے، تنویر جلد از جلد، نوشابہ کی رضامندی کا پیام لائے تاکہ یہ تقریب جلد از جلد انجام پا جائے اور پھر اطمینان سے وہ یاد خدا میں مصروف ہو جائیں، مطب ترک کر دیں ساری جائداد و املاک نوشابہ کے نام منتقل کر دیں اور عبادت و ریاضت میں مصروف ہو جائیں اور کچھ عرصہ بعد، مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ میں ہجرت کر جائیں۔ اکثر ان کی زبان پر اقبال کا یہ مصرعہ رہتا تھا، جسے وہ بار بار گنگنایا کرتے تھے

"میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں!"

وہ اپنی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھے کہ شہزادی کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔



نرمی اور ملاطفت کے ساتھ پوچھا،

"کیا بات ہے شہزادی ــــ ہزار دفعہ کہہ دیا، گھر کے کام کاج سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے جو کچھ بات چیت کرنا ہو رشیدہ سے کر لیا کرو،"

شہزادی نے جیسے باتوں میں سے ایک بات نکالی سنی کہنے لگی

"میاں کیا دروازہ بند کر دوں اندر سے؟"

یہ الفاظ بم کے گولے کی طرح ڈاکٹر صاحب کے قلب نازک پر اثر انداز ہوئے۔

بے شک شہزادی صورت دار لڑکی ہے لیکن زندگی کے کسی دور میں بھی وہ آوارہ اور بداخلاق نہیں رہے تھے اور خود شہزادی کے متعلق بھی اب تک ان کا اثر یہی تھا کہ باحیا اور باکردار لڑکی ہے۔ اتنے برسوں سے ملازم تھی مگر اس کی شرارتوں کی شکایات تو بار بار ان کے کانوں تک پہنچیں لیکن اس کی آوارگی کے بارے میں اس کی سب سے بڑی مخالف، اور دشمن رشیدہ تک کو حرف زنی کا موقع نہیں ملا

اور پھر اگر یہ کمبخت آوارہ بدمعاش بھی ہے تو مجھ سے لگاوٹ کیسی طرح کر سکتی ہے؟ میں تو ہمیشہ اسے نوکر ہونے کے باوجود نوشابہ کی طرح لڑکی ہی سمجھتا رہا ہوں، پھر اسکی یہ جرأت؟ یہ ہمت!

کیا دماغ چل گیا ہے اس احمق کا!

پاگل ہو گئی ہے یہ؟

دو چار جوتے لگا کر دماغ ٹھیک کر دوں اسکا،

سوچ کر انھوں نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورا اور کہا۔

"کیا کہتی ہے!"

لیکن اس وقت تو اس کی کیفیت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی ڈاکٹر صاحب سے اگرچہ انہوں نے کبھی ڈانٹ ڈپٹ یا مار پیٹ اس کے ساتھ نہیں کی تھی اس کی جان نکلتی تھی۔ ان کی آواز سن کر سہم جاتی تھی۔

لیکن آج؟

آج وہ بڑے عزم اور تیور کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی رہی، نہ ہراس، نہ دہشت، نہ ۔۔۔

یہ کیفیت دیکھ کر خود ڈاکٹر صاحب سہم گئے۔ ان کا وہ قہر و غضب رخصت ہو گیا، انہوں نے نرم اور ملائم لہجہ میں کہا،

"کیا بات ہے شہزادی، کیا کہنا چاہتی ہے تو؟"

وہ بولی، "بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں اور کہے بغیر جاؤں گی نہیں اور کھلے کمرے میں کہہ نہیں سکتی!"

ڈاکٹر صاحب نے اسی طرح نرم اور مشفقانہ لہجہ میں پوچھا۔

"کیوں نہیں کہہ سکتی؟"

وہ کہنے لگی، "صاحب دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں اور بات ایسی ہے کہ آپ کے سوا میں دیوار کو بھی نہیں بتا سکتی، آپ یقین کریں گے تو میں گھر میں رہوں گی نہیں یقین کریں گے تو بوریا بستر باندھ کر آئی ہوں جدھر منہ اٹھا چلی جاؤں گی۔"

یہ کیسی عجیب باتیں تھیں!

یہ ایک ایسی بے زبان ہستی کے منہ سے نکل رہی تھیں جس نے کبھی ان کے سامنے کھڑے ہو کر نطق و کلام کی جرأت نہیں کی تھی، اس زبان میں، اس لب



ولہجہ میں، اس تیور میں ضرور کوئی خاص بات ہے، اب انہیں بھی اشتیاق پیدا ہوا، انہوں نے کہا،

"لیکن پگلی یہاں ہے کون؟ کہہ دے جو کچھ کہنا ہے؟"

وہ انکار میں سر ہلاتی ہوئی بولی،

"یہ نہیں ہوگا ___ بالکل اکیلے میں کہوں گی!"

ڈاکٹر صاحب کو اس کی نیت اور کردار پر جو اعتماد تھا وہ پھر ابھر آیا، انہوں نے سوچا ضرور کوئی خاص بات ہے اور شاید بہت ہی اہم بھی ہے جواب دیا۔

"اچھا بند کر لو!"

شہزادی نے پیچھے ہٹ کر اندر سے کنڈی لگا دی، پھر اپنے دوپٹہ کے کونے میں جو گرہ لگی ہوئی تھی اسے کھولا، پھر ایک چھوٹی سی شیشی نکالی اور ان کے سامنے رکھ دی!

ڈاکٹر صاحب نے الٹ پلٹ کر شیشی کو دیکھا اور کہا،

"یہ تجھے کہاں ملی؟"

وہ بولی "یہ بتائیے یہ آپ کی ہے یا نہیں؟"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "ہاں میری ہے، یہ زہر ہے، اسے میں ہمیشہ سیف میں بند رکھتا ہوں اور خاص خاص مریضوں کو تھوڑی سی مقدار میں دیتا ہوں۔ ابھی پرسوں اس کی تین شیشیاں میں نے منگوائی تھیں، اور اب تک ان کے استعمال کی نوبت نہیں آئی ہے ___ ٹھہرو ___"

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب اٹھے، اور جیب سے کنجی نکال کر سیف کھولا تو صرف دو شیشیاں تھیں!"

سیف بند کیا اور حیرت اور کسی حد تک دہشت کے ساتھ کہا۔

"ہاں وہی ہے!"

شہزادی نے سوال کیا،

"یہ دوا، یہ زہر کون لایا تھا؟"

ڈاکٹر صاحب: (کچھ سوچتے ہوئے) تمام کاروبار اب خالد کے ہاتھ میں ہے وہی لایا تھا۔

شہزادی: کیا آپ نے انہیں بتایا تھا کہ یہ زہر ہے، یا نہیں بتایا تھا!

ڈاکٹر صاحب (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں یاد آیا کہا تھا، ایک مریض کے لئے فوری ضرورت تھی۔ میں نے خالد کو کیمسٹ کے نام خط لکھ دیا تھا کہ فوراً لے آئے جاکر، لیکن احتیاط سے لانا، زہر ہے۔"

شہزادی: پھر آپ نے استعمال نہیں کیا۔

ڈاکٹر صاحب: نہیں ـــــ کیونکہ مریض وہی تھا، یہ سن کر کہ زہر استعمال کرایا جارہا ہے اس نے انکار کر دیا، میں نے لاکھ لاکھ کہا، تھوڑی مقدار میں یہ تریاق ہے۔ زیادہ مقدار میں زہر ہے، بہت زیادہ مقدار میں زہر ہلاہل ہے، مگر وہ کسی طرح نہیں مانا ـــــ اس وقت خالد بھی کھڑا ہوا تھا۔

شہزادی: پھر بھی آپ مجھ سے پوچھتے ہیں یہ زہر میرے پاس کہاں سے آیا ہے!

ڈاکٹر صاحب: تو خالد لے گیا یہاں سے"

شہزادی: آپ کی جیب سے اگر کوئی کنجی نکال سکتا ہے تو وہ سیف اگر کھول سکتا ہے تو وہ سیف کے اندر سے کوئی چیز نکال سکتا ہے



تو وہ شیشی پر زہر کا لکھا ہونا اگر کوئی پڑھ سکتا ہے تو وہ "اس شیشی میں زہر ہلاہل ہے، یہ اگر کوئی معلوم کر سکتا ہے تو وہ ـــــ یا میں!

ڈاکٹر صاحب: ہاں وہی،

شہزادی: تو یہ وہی لے گئے تھے، ـــــ لیکن چھپے مارنے نہیں۔ آپ کو ہلاک کرنے کے لئے۔"

# مزید انکشاف

شہزادی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر ڈاکٹر صاحب ہکا بکا رہ گئے، وہ چاہتے تھے کہ شہزادی کو جھٹلائیں لیکن اسے جھٹلانے کی ہمت نہیں تھی! کس طرح جھٹلاتے؟

آخر حواس بجا کر کے انہوں نے ارشاد فرمایا:

"لیکن میں نے کیا بگاڑا ہے اس کا؟"

وہ بولی، "آپ تو معصوم ہیں، بیگم صاحبہ (حسینہ بیگم) اللہ ان کی تربت ٹھنڈی رکھے، وہ تو سگی بہن تھیں وہ تو سگی خالہ تھیں، وہ تو ان ماں بیٹے کی سب سے بڑی محسن تھیں، آپ نے بھی ان کا مان رکھا تو انہی کی وجہ سے"

"ہاں، ہاں ــــ بالکل۔"

"مگر انہوں نے کیا بگاڑا تھا؟"

"کیا مطلب؟ ــــ تو کیا کہنا چاہتی ہے"



"انہیں بھی زہر دیا گیا اور انہیں بھی اپنی ماں، بیٹے اور باپ نے قتل کر دیا!"

ڈاکٹر صاحب کو چکر آنے لگا، معلوم ہوا زمین اور آسمان گھوم رہے ہیں لیکن خوش قسمتی سے وہ آرام کرسی پر دراز تھے، بچ گئے، ورنہ یقیناً فرش پر دھڑام سے گرتے ــــ اور شاید مر جاتے!

کچھ دیر تک سناٹا چھایا رہا، بڑی مشکل سے کئی منٹ کے بعد ڈاکٹر صاحب کے حواس بجا ہوئے، انہوں نے کہا۔

"یہ تو کیا کہہ رہی ہے شہزادی؟"

وہ بولی، "اگر میں جھوٹ بولتی ہوں، تو خدا اور رسول کی لعنت مجھ پر میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے!"

"کیا سنا ہے تو نے؟"

"ان لوگوں کو باتیں کرتے!"

"کیا باتیں کر رہے تھے یہ لوگ؟"

"ہوا یہ کہ آپ خالد میاں باقاعدہ رات کو شراب پی کر بارہ، ایک بجے آتے ہیں، کبھی نشہ کم ہوتا ہے کبھی زیادہ، چھوٹی بیگم انہیں چاہتی بہت ہیں جب تک آ نہیں لیتے، اور وہ اپنے سامنے انہیں دو لقمے کھلا نہیں لیتیں کیا مجال ہے تو سو جائیں، چاہے ساری رات بیت جائے۔"

"ارے یہ کیا پواڑا لے کر بیٹھ گئی، تو اصلی بات کہہ!"

"کہہ رہی ہوں میاں، ذرا سن لیجئے ــــ کل بھی کوئی بارہ بجے کے قریب آئے، نشہ میں دھت! ــــ!"

"واقعی شراب پیتا ہے؟"

"چلئے ابھی ان کے کمرے میں دیکھ لیجئے، ورنہ تو لیٹی پڑی ہوں گی۔"

"خیر ۔۔۔ پھر؟"

"میرے لئے بھی یہ حکم ہے جب تک وہ کھانا نہ لیں، اور میں برتن اٹھا کر نہ لے جاؤں سو نہیں سکتی۔"

"اچھا ۔۔۔ یہ بھی ہے!"

"لیکن میاں اس کی شکایت نہیں، کام کروں گی تو دو روٹی ملیں گی، یہ تو میرا فرض ہے، بیٹی (نوشابہ) نے کئی مرتبہ منع بھی کیا کہ تم دس بجے سو جایا کر، بارہ بجے تک، ایک بجے تک، دو بجے تک نہ جاگا کر، لیکن ان سے ہوں ہاں کر دی، مگر چھوٹی بیگم (رشیدہ) کو کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔"

"پھر تو بہک چلی، یہ باتیں کون پوچھ رہا ہے تجھ سے؟"

"جی ۔۔۔ تو وہ آئے، میں نے کھانا لے جا کر رکھا اور چلی آئی باہر، کہ تھوڑی دیر میں برتن جا کے لے آؤں گی، لیکن باہر نکلی ہی تھی کہ گرم گرم اور تیز تیز باتوں کی آواز آنے لگی میرے کان میں، ضبط نہ کر سکی، گئی اور دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی، دیکھتی کیا ہوں چھوٹی بیگم اور خالد میاں میں جھگڑا ہو رہا ہے۔"

"وہ کہہ رہے تھے، کل شاہد بمبئی سے آ جائے گا اور چونکہ نوشابہ سے چاہتی ہے، اور ڈاکٹر دلاور ۔۔۔ آپ کا نام لیتے ہیں وہ تو ۔۔۔ نوشابہ کو چاہتا ہے لہٰذا ضرور اس کی شادی شاہد سے ہو جائے گی تم نے اپنی بہن کو آہستہ اثر کرنے والا زہر دیا تھا، وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کافی عرصے کے بعد مری، میرے پاس زہر ہلاہل ہے یہ حلق سے اترا اور آدمی ڈھیر ہوا؛

یہ ڈاکٹر دلاور کے حلق میں اتار دیا جائے گا اور جب وہ مر جائے گا، تب نوشابہ سے میں شادی کر دوں گا۔ پھر کوئی طاقت مجھے اس کے اور اسکی دولت حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی، یہ دیکھو ۔۔۔

یہ کہہ کر خالد میاں نے جیب سے یہی شیشی نکال کر دکھائی۔

چھوٹی بیگم نے پوچھا یہ کیا ہے؟"

وہ بولے "اسے کہتے ہیں میاں کی جوتی میاں کی چاند، اس کی ڈاکٹر دلاور نے مجھ سے تین شیشیاں منگائی تھیں اور بڑی احتیاط سے سیف میں رکھ دیں، دوپہر کو جب تم انہیں مربع مسلم کھلا رہی تھیں میں نے ان کی جیب سے کنجی نکالی، سیف کھولا اور یہ شیشی اٹھا لایا۔

"پھر رشیدہ نے کیا کہا یہ بات سن کر؟"

وہ کہنے لگیں، ذرا پانی دیکھو، پانی کی دھار دیکھو، اگر وہ نوشابہ کی شادی تم سے نہ کریں تو بے شک زہر دے دینا، ویسے مجھے یقین ہے کہ کر دیں گے کیونکہ میں نے شاہد کا انہیں دشمن بنا دیا ہے اور تمہارا اشتیاق انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ شاہد بمبئی سے یہاں نہیں آئے گا تو سیدھے گھر جائے گا ۔۔۔ "کیوں میاں کیا واقعی ہے؟"

"چھوڑو یہ باتیں کام کی باتیں کرو ۔۔۔ ہاں پھر؟"

"پھر وہ کہنے لگیں، لہٰذا تمہیں شاہد سے کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہئے"

"پھر وہ کیا بولا؟"

"وہ کہنے لگے، مجھے شاہد سے نہیں ڈاکٹر دلاور کی" ماما سے اندیشہ ہے، تم نہیں جانتیں وہ نوشابہ کے لئے سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ اگر کسی چمار سے بھی شادی کرنا چاہے تو کر دے گا، اس بڈھے کو

راستہ سے ہٹانا ضروری ہے!!"

"پھر یہ شیشی تیرے ہاتھ کیسے آئی؟"

"میں دروازے کی اوٹ سے کھڑی دیکھ رہی تھی جب ماں بیٹے کی باتیں ختم ہو گئیں اور چھوٹی بیگم نے بھی بیٹے کے فیصلے پر صاد کر دیا تو انہوں نے نہایت اطمینان سے شیشی بھی جیب میں رکھ لی، اتنی رات گئے ہونے کے بعد صبح نو بجے کے بعد جاگتے ہیں، میں صبح ہی صبح جھاڑو دینے چلی جاتی ہوں، میں نے شیشی جیب سے نکال لی اور چپ چاپ چلی آئی ـــــ میاں زندگی میں یہ میری پہلی چوری ہے، اللہ گواہ ہے! میں نے آج تک کسی کا ایک دھیلا بھی نہیں چرایا ہے، لیکن یہ آپ کی جان کا معاملہ تھا۔ جسے خدا رسولؐ کے بعد میں سب سے زیادہ مانتی ہوں، جس کے اشارے پر میں اپنی جان قربان کر سکتی ہوں، جس کی ادنیٰ ... نوکر ہوں لیکن جس نے ہمیشہ مجھے لڑکی کی طرح مانا ہے"

اور وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی"!

---

# ایک اور انکشاف

ڈاکٹر صاحب کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ان کی آنکھیں کھل گئیں بلکہ کہنا چاہئے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

بہترین ڈاکٹر صاحب ہونے کے باوجود وہ حیران تھے کہ کسی بیماری کے حسینہ بہترین علاج، تیمارداری اور دوا دوش کے باوجود کیوں مر گئی؟

یہ راز آج کھلا!

لیکن اب حسینہ مر چکی تھی!

قبر میں اس کی ہڈیاں خاک ہو چکی تھیں!!

اب ثبوت فراہم کر کے ان مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانا مشکل تھا۔

دل ہی دل میں انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ خالد سے انہوں نے نوشابہ کی شادی نہیں کر دی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے اس طرح جیسے ایک باپ بچی کے آنسو پونچھتا ہے؛

اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھے اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"شہزادی تیرا احسان میں عمر بھر نہیں بھولوں گا ۔۔۔ مجھے اپنی زندگی کی پرواہ نہیں، ویسے بھی عمر کی اس منزل تک پہنچ چکا ہوں کہ لب گور ہوں۔ آج مرا کل دوسرا دن، لیکن تو نے میری بچی نوشابہ کی جان بچا لی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کی شادی اس نمک حرام رشیدہ کے بدمعاش بیٹے خالد سے کر دوں گا۔"

شہزادی نے دانتوں تلے انگلی داب لی اور کہا۔

"ارے ۔۔۔"

ڈاکٹر صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا اور پوچھا:

"کیا بات ہے؟"

وہ بولی "واقعی میری سے زیادہ پیاری منیا کی جان بچ گئی۔ اگر کہیں آپ نے ایسا کر دیا ہوتا، تو ضرور وہ زہر کھا لیتیں، خودکشی کر لیتیں۔"

"کیوں؟ ۔۔۔ کس لئے؟"

"وہ خالد میاں سے جتنی نفرت کرتی ہیں، اس سے کہیں زیادہ شاہد بھیا سے محبت کرتی ہیں!"

"وہ محبت کرتی ہے شاہد سے۔"

"جی میاں ۔۔۔ بہت زیادہ لیکن سچی محبت اور یہی حال شاہد بھیا کا ہے، لیکن میاں ایمان لگتی کہوں گی۔ خدا کو منہ دکھانا ہے، شاہد بھیا جیسا انمول ہیرا بھی کم ہی ملے گا دنیا میں، اور اسی لئے تو میری منیا چاہتی ہیں انہیں اتنا زیادہ۔"

اور پھر شہزادی نے از اول تا آخر ساری داستان سنا ڈالی، اور کہا۔



"خالد میاں نے جب شاہد بھیا کو ہاکی سے زخمی کیا، وہ نہیں بولے ضبط کر گئے لیکن کالج کے لڑکوں کے سامنے جب منیا (نوشابہ) کا نام لے کر انہیں طعنہ دیا تو ضبط نہ کر سکے ایسا جما کر مکا مارا کہ پانچوں انگلیاں بن گئیں۔ جب کی خبر انہیں پستول کی گولی کی صورت میں ملی!"

ڈاکٹر صاحب نے ندامت کے لہجہ میں کہا:

"مجھے کیا معلوم تھا، معاملات یہ ہیں!"

"ہاں آپ کیا جانیں ۔۔۔ بیگم صاحب (رحمتیہ) سب کچھ بتانے والی تھیں آپ کو، لیکن وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں! ۔۔۔ ورنہ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان سب کو گھر سے نکال کر باہر کریں گی! خود مجھ سے کہا تھا۔"

"اور تم تب رہیں آج تک۔"

"لو میاں کیا کہہ دی!"

"مجھے کیوں نہیں بتائیں سب باتیں؟"

"آپ یقین ہی نہیں کر سکتے!"

"کیسے نہیں کرتا؟ ۔۔۔ آج کیسے کر لیا؟"

(مسکراتے ہوئے) آج کی بات دوسری ہے!"

"دوسری کیوں ہے؟ ۔۔۔ کیا خاص بات ہو گئی آج! میں ہمیشہ سے تجھے سچا سمجھتا ہوں!"

"سمجھتے تو ہیں، لیکن چھوٹی بیگم نے ایسا جادو چلایا تھا ظاہری خدمت اور جادو کا، کہ اگر کیا فرشتہ بھی آسمان سے اتر آتا اور آپ کی رائے ان کے بارے میں بدلنا چاہتا تو آپ یقین نہ کرتے!"

"ارے پگلی آخر یقین کیا یا نہیں؟"

"ہاں کیا تو!"

"پھر کیوں بک بک کئے جا رہی ہے؟ — آج بھی میں نے کیوں نہیں جھوٹا کہہ دیا تجھے؟"

"وہ تو میں اس شیشی (دوا کی شیشی دکھاتے ہوئے) کو دعا دیتی ہوں" یہ میری گواہ نہ ہوتی تو میاں آج بھی یقین نہ کرتے۔"

ڈاکٹر صاحب ہنسنے لگے کہنے لگے

"ہاں کہتی تو ٹھیک ہے!"

وہ بولی "لیکن میاں اب لوگوں کو سزا ضرور ملنی چاہیے — ہائے یہ غضب کہ آپ کو زہر —!"

"تو ٹھیک کہتی ہے شہزادی، ان لوگوں کو سزا ملے گی — اور ضرور ملے گی، لیکن میرے یا قانون کے ہاتھ سے نہیں —"

"پھر کس کے ہاتھ سے ملے گی؟"

"خدا کے ہاتھ سے!"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"ہاں شہزادی — حسینہ اب زندہ نہیں ہو سکتی، ان لوگوں کے خلاف ثبوت پیش کرنا آسان نہیں، پھر اگر یہ بات اچھالی ہوں تو خواہ مخواہ کی جگ ہنسائی ہو گی، لہٰذا اس معاملہ کو تو اب خدا کو سونپتا ہوں —!"

"یہ بھی ٹھیک ہے!"

"اور پھر کچھ سوچتی ہوئی بولی۔

"لیکن میاں یہ تو بتائیے کیا یہ لوگ اب بھی اس گھر میں رہتے رہیں گے؟"



"(مسکراتے ہوئے) تیری کیا رائے ہے؟"

"میری رائے تو یہ ہے کہ ابھی چل کر دیجئے سب کو کچھ تو معلوم ہو۔"

"لیکن اس کی ضرورت بھی نہیں ہے!"

"کیوں نہیں ہے میاں؟"

"یہ سب تھوڑی دیر میں بھاگ کھڑے ہوں گے، دیکھ لینا!"

"وہ کیسے —؟"

"جس روز تو شاہد کی شادی ہو گی، شاہد اسی دن — بلکہ شاید شادی کی تیاریاں دیکھتے ہی!"

"(چٹکی بجاتے ہوئے) کیا شاہد بھتیجے آپ بٹیا کو بیاہ دیں گے؟"

"(ہنستے ہوئے) جب تیری بھی رائے یہی ہے تو کرنا ہی پڑے گا"

"میری تو دل و جان سے رائے ہے!"

"بس تو پھر یہی ہو گا!" — ارے پگلی تو اب دروازہ کھولے گی یا نہیں؟"

شہزادی نے جلدی سے کنڈی کھول دی اور اس کے چند ہی منٹ بعد حواس باختہ، پریشان اور بدحواس چھوٹی بیگم صاحبہ (رشیدہ) تشریف لائیں اور شہزادی کو دیکھتے ہی کہنے لگیں

"شہزادی تو یہاں ہے، میں نے سارا گھر چھان مارا۔"

انھیں کیا خبر اب شہزادی بدل چکی تھی! اب شہزادی پہلے والی بھیگی بلی شہزادی نہیں تھی، وہ شیشی اب بھی اس کے پاس تھی، اس نے کچھ جواب دینا چاہا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے فرمایا

"ہاں یہاں آئی تھی کام سے!"

رشیدہ نے شہزادی سے سوال کیا،

"کیا تم نے خالد کے کمرے میں جھاڑو دی تھی؟"

وہ بولی۔ "ہاں چھوٹی بیگم دی تو تھی۔"

وہ کہنے لگیں۔ "مگر خالد کی جیب سے چند اشرفیاں غائب ہیں اور تیرے سوا وہاں کوئی نہیں گیا۔ لیکن اشرفیاں نہ میں نے دیکھیں نہ چرائیں۔"

وہ غصہ میں بھڑک کر بولیں۔

"تو؟ — تجھ سے بڑھ چڑھ کر چوٹّا کون ہوگا؟ سیدھے سے بتاتی ہے یا پھر دوسری تدابیر اختیار کروں؟"

شہزادی نے جواب دیا۔

"بتا تو چکی، دوسری تدبیر اختیار کرنا ہو تو کر لیجئے!"

ان الفاظ، اور اس لب و لہجہ سے بہت کچھ تاڑ لیا اور رشیدہ نے دفعتہً پہلو بدلا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو کیا چرائے گی، میں تو مذاق کر رہی تھی — آج کھانا پکے گا یا نہیں۔ یہ تو نہ بھولنا کہ بھائی صاحب کھانے پینے میں وقت کے بہت پابند ہیں، دیر ہوگئی تو اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ جائیں گے۔ اور لاکھ لاکھ خوشامد کرو مگر کیا مجال ہے جو ایک لقمہ بھی توڑ لیں۔"

شہزادی نے چوٹ کی۔

"چھوٹی بیگم میں جانتی ہوں آپ کو ہمارے میاں کا کتنا خیال رہتا ہے۔ بے شک غلطی ہوگئی، ابھی دم بھر میں پکا دیتی ہوں، اطمینان رکھیئے۔"

اتنے میں خالد کی آواز آئی، وہ دیوانہ وار ماں کو پکار رہا تھا۔ شہزادی کو وہیں چھوڑ کر وہ بیٹے کی طرف لپکیں کیونکہ زہر کی شیشی کے غائب ہونے کا



علم ہوگیا تھا، اور دونوں از حد گھبرائے ہوئے تھے، دونوں کا شبہ شہزادی پر تھا، لیکن معاملہ کچھ ایسا تھا کہ اس کا یقین کامل کے باوجود کوئی سخت رویہ نہیں اختیار کر سکتے تھے۔

رشیدہ کے جانے کے بعد شہزادی نے مسکراتے ہوئے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔

"دیکھ لیا؟ —!"

ڈاکٹر صاحب نے زہر خند کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں خوب دیکھ لیا — خدا دشمن کو بھی یہ دن نہ دکھائے۔"

وہ بولی "معلوم ہوتا ہے شیشی کے غائب ہونے کا پتہ چل گیا ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے تائید کی۔ ہاں وہ تو چہرہ بتا رہا تھا۔

اور خالد میاں جس گھبرائی ہوئی آواز میں چیخ چیخ کر چھوٹی بیگم کو بلا رہے تھے اس سے پتہ نہیں چلتا۔

"اس سے بھی خوب پتہ چل گیا — لیکن فی الحال تو انجان بنی رہو کچھ بھی نہ قبول —!"

"وہ تو کروں گی، — لیکن خون کھول رہا ہے میرا بھائی صاحب کے کھانے کی اب بھی کتنی فکر ہے!"

ڈاکٹر صاحب ہنسنے لگے، انھوں نے کہا۔

"ابھی لو شابہ کو بھی نہ بتانا، بعد میں دیکھا جائے گا۔"

# خوشامد

شہزادی باورچی خانے میں پہنچی ہی تھی کہ پیچھے پیچھے چھوٹی بیگم بھی تشریف لائیں اور میز پر نظریں جما کر بولیں،

"ارے سن تو سہی —"

اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ بالا خانے پر اپنے کمرے کی طرف تشریف لے جا رہی تھیں، اس کا مطلب یہ تھا کہ ساتھ ساتھ آؤ، یہ مطلب وہ سمجھ گئی، اور ان کے پیچھے پیچھے ہو لی، کمرے میں پہنچ کر وہ اطمینان سے تخت پر بیٹھ گئیں، جس پر دری بچھی تھی، اور دری پر ایک دودھ کی طرح سفید چادر تھی، اور اس چادر پر جا نماز سائز کا ایک نہایت خوبصورت، خوشنما، اور قیمتی قالیچہ تھا، اور اس کے آخر میں ایک گاؤ تکیہ رکھا ہوا تھا، وہ اطمینان سے اس تخت معلی پر بیٹھ گئیں،

سامنے پان دان رکھا تھا اسے کھسکا کر قریب کر لیا۔ پھر بڑی احتیاط سے پان بنا کر منہ میں رکھا اور اسے چباتی ہوئے شہزادی سے جو اب تک کھڑی تھی، کہا۔



"کیوں ری بھائی صاحب سے کیا باتیں کر رہی تھی؟"

"جی تو چاہا اگل دے سب کچھ لیکن ڈاکٹر صاحب کی ہدایت یاد آ گئی" کہنے لگیں،

"میں بھلا کیا کروں گی — بستر ٹھیک کر رہی تھی، سامان درست کر رہی تھی، جھاڑ دے رہی تھی!"

"اتنی دیر تک ؟"

"سارا کمرہ گرد سے اٹا پڑا تھا، کوئی توجہ ہی نہیں کرتا!"

"اچھا ایک بات تو بتا شہزادی!"

"جی —"

"تجھے یہاں اس کمرے میں کوئی چیز پڑی ہوئی تو نہیں ملی تھی!"

"کیسی چیز بی بی —؟ اشرفی!"

(ہنستے ہوئے) "چل ہٹ، اشرفی نہیں تیرا سر — کوئی چیز؟"

"کوئی چیز نہیں؟"

"کوئی روپیہ، کوئی شیشی!؟"

"نہیں تو —!"

"دیکھ شہزادی جھوٹ نہ بول، میں تجھے جانتی ہوں —!"

"بی بی جانتی ہو، تو جھوٹ کیوں بتا رہی ہو؟"

غصے کی جھلک چہرۂ زیبا پر نظر آئی، لیکن دفعتہ نرمی بھی ہو گئی، کہنے لگیں،

"تو نہیں جانتی، میری ایک بڑی قیمتی دوا گم ہو گئی ہے وہ بڑی مشکل سے خالد نے منگوائی تھی، رات تک تو تھی، اب کہیں نہیں ملتی، نہ جانے کہاں

رہ گئی!"

"نہ جانے!"

"کوٹھڑے کی کٹ میں کونے کھدرے میں، ادھر اُدھر دیکھو، شاید مل جائے۔"

"دیکھوں گی، مل گئی تو لا کر دے دوں گی!"

"مل گئی تو منہ میٹھا کروں گا تیرا —— لے تو بھی کیا یاد کرے گی، یہ دس روپے لے۔"

"یہ کیوں بی بی؟"

"یہ تو ابھی دیتی ہوں، ڈھونڈ کر لائی تو پورے سو روپے دوں گی تجھے؟ —— کیوں ری تیری شادی کب ہوگی ——؟"

(شرماتے ہوئے) "بی بی ہم نہیں جانتے، ہم سے یہ باتیں نہ پوچھا کرو!"

وہ ہنسنے لگیں۔ "اس لئے پوچھتی ہوں کہ تیرے جہیز کا بھی تو کچھ بندوبست کروں، یہ کام اور کون کریگا؟ تیرے ماں باپ تو زندہ نہیں ہیں!"

"ماں نہیں ہیں، لیکن اللہ میاں کو سلامت رکھے، آج تک مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ نہیں ہیں!"

"ایمان سے بتانا میرا سلوک تیرے ساتھ کیسا ہے؟"

"اب تو اچھا ہے!"

وہ ہنس پڑیں

"اب اچھا ہے پہلے بُرا تھا کیوں ری۔"

شہزادی بھی مسکرانے لگی!

# باپ کا فیصلہ

تنویر اور نوشابہ کی گفتگو نے کافی طوالت اختیار کر لی تھی، اس عرصہ میں ڈاکٹر صاحب اور شہزادی کے مابین جو گفتگو ہوئی اس نے ڈاکٹر صاحب کے خیالات کی دنیا بدل دی، انہوں نے سوچا، تنویر اب تک نہیں آئی، ضرور کچھ دال میں کالا ہے،

شاید نوشابہ نے میری تجویز رد کر دی اور تنویر اسے سمجھا رہی ہے،

اگر رد کر دی تو بہت اچھا کیا،

لیکن میں تنویر کا انتظار کیوں کروں؟ —— خود وہاں کیوں نہ پہنچ جاؤں اور رخ بدل دوں جا کر گفتگو کا، اپنی غمزدہ اور روٹھی ہوئی بیٹی کو خوش کروں، منالوں۔

یہ سوچ کر وہ نوشابہ کے کمرے میں پہنچے، جو سوچا تھا وہی پایا، نوشابہ کے چہرے پر، بے بسی، غم اور صدمہ کی کیفیت طاری تھی اور یہی حال تنویر کا بھی تھا، ان دونوں کو بالکل نہیں معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب میں

میں انقلاب ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر نوشابہ کھڑی ہو گئی، ڈاکٹر صاحب نے پیار اور محبت کی نظروں سے اسے دیکھا اسے سینے سے لگایا، پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا۔

"بیٹھ جاؤ بیٹی!"

وہ بیٹھ گئی، خود ڈاکٹر صاحب بھی پاس ہی بیٹھ گئے، انھوں نے تنویر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں ——؟"

جو باتیں ہوئی تھیں ان کے انکشاف کے لئے یہ جگہ موزوں نہیں تھی۔ کہنے لگی

"کچھ نہیں —— بہت دنوں کے بعد دیکھا تھا، اپنی بچی کو آئی تو اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا۔"

ڈاکٹر صاحب نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں کیا کہنا۔ بڑی محبت ہے آپ کو اس بچی سے ہے؟ —— مکار کہیں کی!"

قبل اس کے کہ تنویر جواب میں کچھ کہے، ڈاکٹر صاحب نے نوشابہ سے کہا۔

"بیٹی آج شاہد ہسپتال سے ڈسچارج ہو رہا ہے!"

وہ افسردہ لہجہ میں تصویر غم بنی ہوئی گویا ہوئی۔

"جی ہاں معلوم ہے!"

ڈاکٹر صاحب نے شہزادی کے دیئے ہوئے معلومات کی مزید تصدیق اس کیفیت سے کرلی، کہنے لگی۔

"تو بیٹی، نہ اس کا کمرہ صاف ہوا ہے نہ بستر ٹھیک ہوا ہے، اتنے دن کے بعد آ رہا ہے پر تکلف دعوت کا اہتمام ہے، یہ تو تم کو بھی معلوم ہوگا کہ اسے کیا کیا چیزیں مرغوب ہیں، وہ سب پکنی چاہئیں تھیں، آج، تاکہ یہاں آ کر وہ یہ محسوس کرتا کہ اپنے گھر میں آ گیا ہے، آج حمیدہ زندہ ہوتی، وہ مر گئی تھی، اگر آج اگر حسینہ زندہ ہوتی، تمہاری ماں تو کیا اتنے ہی خشک طریقہ سے اس کی پذیرائی ہوتی وہ تو اس گھر کو دلہن بنا چکی ہوتیں، آج جشن کی کیفیت طاری ہوتی! وہ سارے ماحول پر اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں تم بھی اس سے خاصی مانوس ہو اور وہ اپنی سعادت، شرافت اور معقولیت کے اعتبار سے سزاوار بھی اسی کا ہے، تم نے بھی کچھ خیال نہ کیا ——؟ کتنا بڑا اندھیر ہے!"

ڈاکٹر صاحب کی یہ باتیں جتنی نوشابہ کیلئے عجیب اور حیرت انگیز تھیں اس سے زیادہ تنویر کیلئے تھیں، ابھی وہ کیا سن کر آئی تھی، اور ابھی یہ کیا کہہ رہے ہیں؟

ذرا دیر کے لئے اس نے سوچا، کہیں سٹھیا تو نہیں گئے ہیں؟ دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے؟ اس نے ایک اچٹتی سی نظر ڈالی، اور کہا۔

"بھائی صاحب ——"

ڈاکٹر صاحب نے اس سے کچھ نہ کہنے دیا۔ گویا ہوئے۔

"باتوں میں وقت ضائع نہ کرو، آج تم ہرگز نہیں جا سکتیں، میری بچی نوشابہ کا ہاتھ بٹاؤ، شاہد کا کمرہ ٹھیک کرو، اس کے لئے دعوت کا اہتمام کرو۔"

تنویر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، اس نے پوچھ ہی لیا۔

"کیا وہ یہیں رہے گا آپ کے پاس؟"

وہ بگڑتے ہوئے گویا ہوئے،

"اور کس کے پاس رہیگا؟ کیا وہ میرا بیٹا نہیں ہے؟ کیا وہ میرا لختِ جگر نہیں ہے؟..... میں سوچتا ہوں وہ آئے تو رفتہ رفتہ سب کچھ سونپ کر اُسے ہجرت کر جاؤں، حسینہ کے بعد زندگی کاٹے نہیں کٹتی کسی طرح سے!"

یہ کہتے کہتے ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں آب گوں ہوگئیں اور گلا گلوگیر ہوگیا۔ نوشابہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے، اور تنویر بھی اپنے قطراتِ اشک، روک نہ سکی؛

ڈاکٹر صاحب نے کہا، "تنویر! شاہد پر اوپر سے لیکر اب تک بہت ظلم ہوئے ہیں، وہ اتنا بے زبان ہے کہ کبھی اس نے کسی کی شکایت نہیں کی، حد یہ ہے کہ اپنی صفائی تک میں کچھ نہیں کہا۔ لوگ اس پر الزامات تراشتے رہے، تہمتیں لگاتے رہے، بدنام کرتے رہے، لیکن وہ خدا کا بندہ ایک چپ میں سب باتیں ٹالتا رہا، اب اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ مجھے اس کے بارے میں مبتلائے غلط فہمی کیا گیا۔ اور اپنی حماقت سے میں مکر و فریب کا شکار بن ہی گیا۔ اس سے خفا ہو گیا اُسے برا سمجھنے لگا، لیکن پھر بھی اس نے اپنی صفائی میں کچھ نہ کہا؛"

ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے آنسو ڈھلکنے لگا تھا، انھوں نے رومال سے انھیں پونچھا اور کہا۔

"سوچتا ہوں وہ دن جلد آنے والا ہے جب حمیدہ سے ملاقات ہوگی، حسینہ پھر میری بن جائے، اگر حمیدہ نے پوچھا

"میرے شاہد سے آپ نے کیا سلوک کیا تھا؟

تو کیا جواب دوں گا؟"

اگر حسینہ پوچھ بیٹھی، جس لڑکے کو حمیدہ کے بعد میں نے اپنا بیٹا بنایا تھا، اپنا لختِ جگر بنا لیا تھا، اس سے آپ نے کس دل سے بدسلوکی روا رکھی تھی، تو



کس طرح سے آنکھیں چار کر سکوں گا؟"

یہ کہتے کہتے ڈاکٹر صاحب سسکیاں لینے لگے، لیکن جلد ہی اپنی اس کیفیت پر غالب آگئے اور نوشابہ سے مخاطب ہو کر گویا ہوئے۔

"دیکھو بیٹی! حمیدہ کتنا چاہتی تھی تجھے؟ تیرے ہی غم میں اس نے جان دی، حسینہ، صرف تیری ماں ہی نہیں تھی، عاشق بھی تھی، کیا ان دونوں کی روح کو خوش کرنے کیلئے اپنے روسیاہ باپ کو تلافیِ مافات کا موقع دینے کے لئے ایک مان لے گی میری ---!"

ڈاکٹر صاحب کی آواز پھر گلوگیر ہوگئی، تنویر نے کہا۔

"یہ کچھ نہ ہوتا تو بھی کیا نوشابہ آپ کی بات ماننے سے انکار بھی کر سکتی ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں تنویر، تم جواب نہ دو، میں اپنی بچی کے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔ بتا بیٹی، جواب دے!"

نوشابہ کا گلا خود رُندھا تھا، آنسو تھے کہ بہتے جا رہے تھے، دل دھڑک رہا تھا، بدن پر لرزہ طاری تھا، اس وقت اس کی عجیب و غریب کیفیت ہو رہی تھی، انتہائی خوشی، جو کبھی شادی مرگ بن جاتی ہے، انتہائی غم، حمیدہ یاد آرہی تھی، حسینہ یاد آرہی تھی، شاہد کی مظلومیت یاد آرہی تھی، رشیدہ کی سفاکیاں یاد آرہی تھیں، خالہ کی بدمعاشیاں یاد آرہی تھیں، اپنی لاچاریاں اور مجبوریاں یاد آرہی تھیں۔

ان دونوں کیفیتوں نے مل کر اس پر عجیب عالم طاری کر دیا تھا! اسی کشمکش میں وہ گرفتار تھی کہ ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر صاحب نے تقاضا کیا،

"جواب دے بیٹی ـــ میں تیرے منہ سے تیرا صاف جواب سننا چاہتا ہوں!"

نوشابہ جواب نہ دے سکی، آگے بڑھی اور باپ کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اس کی سسکیاں اتنی شدید تھیں کہ سارا بدن ہل رہا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا، وہ خود بھی رو رہے تھے انھوں نے محبت اور شفقت کے ساتھ کہا،

"میری بچی ـــ تو نے جواب دے دیا اور میں نے پا لیا!"

پھر ذرا سے تامل کے بعد کہا۔

"میں تجھے کچھ نہ دے سکا، لیکن شاہد کو دے رہا ہوں، اور مجھے یقین ہے یہ تحفہ میری طرف سے قبول کرے گی، یہ ایسا نادر گراں بہا اور قیمتی تحفہ ہے جو میری جان سے بھی زیادہ قیمتی ہے ـــ!"

نوشابہ اسی طرح باپ کے سینے سے لگی کھڑی سسکیاں لے رہی تھی۔



# چشم بد دور آ گیا!

ڈاکٹر صاحب کے جاتے ہی تنویر نے نوشابہ سے کہا،

"ارے دیکھیں، اب ہنسو بھی تو!"

وہ بے ساختہ مسکرا دی، تنویر نے کہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا چند لمحوں کے اندر اتنا بڑا انقلاب کس طرح آ گیا، کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا ـــ!"

وہ خوشی کا جھولا جھولتی ہوئی بولی۔

"نہ جانے کیا بات ہے ـــ لیکن کوئی خاص بات ضرور ہے!"

تنویر اٹھی، "جاتی ہوں خبر لاتی ہوں!"

تنویر تیر کی طرح سیدھی ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں پہنچی، وہ اب تک اپنے آنسو پونچھنے لگے تھے ـــ اس لئے کہ روانی اشک میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

تنویر گئی اور کہنے لگیں "بھائی صاحب یہ کیا ہو گیا اتنی دیر میں؟"

ڈاکٹر صاحب نے تنویر کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور کہا، "تنویر بہت کچھ کہنا ہے مجھے تم سے لیکن بتاؤ ایسا بھی ہو سکتا ہے اس دنیا میں؟"

وہ حیرت سے ڈاکٹر صاحب کو دیکھتی ہوئی بولی "کیا ہو سکتا ہے بھائی صاحب؟"

[illegible]

"نہیں ہو سکتا! — اور ہو بھی سکتا ہے!"

"کیا یہ بھی ہو سکتا ہے، اس دنیا میں اگر کوئی شخص کسی کو پناہ دے، کسی کو اپنے گھر کا مالک بنا دے، اسی کو ہر چیز سونپ دے، مال، دولت، عزت، ہر چیز — سب کچھ اور پھر اسے انعام یہ دیا جائے کہ زہر ہلاہل سے اس کا کام تمام کرنے کی کوشش کی جائے!"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھائی صاحب، — لیکن یہ دنیا ہے۔ یہاں کیا نہیں ہو سکتا؟ کیا نہیں ہو سکتا؟"

ڈاکٹر صاحب نے ایک آہ سرد کے ساتھ پوچھا

"کیوں تنویر کیا تم جیسی بہن بھی جسے میں سمجھتا تھا ہوں جو مجھے کتنی عزیز ہے، مجھے دھوکہ دے سکتی ہے؟"

تنویر تڑپ پڑی، اس نے حیرت کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دھوکا؟ — میں آپ کو دھوکا دے سکتی ہوں؟ میں نے آپ کو دھوکا دیا؟"

ڈاکٹر صاحب نے پُر درد انداز میں کہا۔

"ہاں تم نے؟"

تنویر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"تمہیں معلوم تھا کہ حسینہ شاہد پر جان دیتی تھی، تمہیں معلوم تھا کہ نوشابہ شاہد کو چاہتی ہے، تمہیں معلوم تھا کہ میں غلط طور پر شاہد سے خفا ہوں محض غلط فہمی کی بنا پر — مگر کیا تم نے میری غلط فہمی رفع کی؟ مجھے صحیح حالات بتائے؟ — بلکہ الٹا یہ کہ نوشابہ کے پاس خالہ کا پیام لے کر چلی گئیں میری طرف سے کتنا ذلیل کیا ہے تم نے مجھے میری بچی کی نظروں میں، لاحول ولا قوۃ!"



تنویر ہنسنے لگی "بھیا آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

"غلط کہتا ہوں کچھ؟"

"آپ پر چھوٹی بیگم صاحبہ اتنی حاوی تھیں کہ اگر وہ کہتیں خدا وہ ہیں تو آپ ایک خدا کو ماننا چھوڑ دیتے۔ میں بھلا کیا کرتی، اپنی بات خراب کر کے آپ خود دانا تھے آپ کو خود ہی سوچنا چاہیے تھا!"

"بڑی غلطی ہوئی مجھ سے بہت نادم ہوں!"

"لیکن یہ زہر وہر کا کیا قصہ بیان کر رہے تھے آپ؟"

ڈاکٹر صاحب نے وہ ساری رام کہانی جو شہزادی نے بیان کی تھی، ایک ایک حرف کر کے سنا دی، تنویر سنتی رہی، پھر دانتوں تلے انگلی داب کر بولی۔

"ہائے یہ اندھیر — نہ آسمان ٹوٹا، نہ زمین پھٹی!"

ڈاکٹر صاحب نے سنجیدہ لہجہ میں کہا۔ "خدا کی لاٹھی بے آواز ہے، وہ کسی مجرم کو معاف نہیں کرتا۔ اطمینان رکھو، اب ان شکم حراموں اور کمینوں پر آسمان بھی ٹوٹے گا اور زمین بھی پھٹے گی —!"

"تو کیا آپ مقدمہ کریں گے؟"

"نہیں تنویر مقدمہ سے کیا بنے گا... صرف رسوائی، اب حسینہ زندہ نہیں ہو سکتی — لیکن رشیدہ کو میں بھی زہر دوں گا!"

"نہیں بھائی صاحب خدا کے لئے ایسا نہ کیجیے گا، خدا نہ کرے آپ کہیں پھنس سکتے، یا آپ کے خلاف کچھ ہوا تو نوشابہ بے موت مر جائے گی!"

ڈاکٹر صاحب نے کہا،

"پگلی ہو تم تو، میں دوسرا زہر دوں گا!"

"وہ کون سا زہر ہے؟ — نہیں جو حسینہ کو دیا گیا تھا جو آہستہ آہستہ

اثر کرتا ہے!"

"نہیں نہ نہیں!"

"پھر کون سا؟"

"زہر ہلاہل، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر — وہ زہر جس کا تریاق نہیں اور جو اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہے گا!"

"بتایئے بھی تو کچھ!"

"تم جلد جلد سارے انتظامات تیار کر ڈالو، لیکن بالکل خفیہ طور پر، سوائے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، نوشابہ کو دلہن بناؤ، میں ہسپتال جاتا ہوں، شاہد کو لینے، قاضی صاحب بھی میرے ساتھ چلے گئے، ابھی اور اسی وقت ان دونوں کا نکاح کر دوں گا، کچھ دوستوں کو بھی فون کئے دیتا ہوں، وہ ہسپتال پہنچ جائیں گے اور وہاں سے ہم سب برات کی صورت میں آئیں گے۔"

تنویر خوشی سے بے خود ہو کر تالیاں بجانے لگی پھر بولی

"سچ بھیا میاں صاحب؟"

انھوں نے جواب دیا۔

"بالکل سچ — یہی ہوگا!"

وہ ماتھے پر ہاتھ مارتی ہوئی بولی —

"یہی ہونا بھی چاہیئے۔"

پھر اس نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا

"اور اس شادی میں کیا رشیدہ بیگم، ان کے شوہر نامدار اور فرزند دلبند سعادت مند شریک نہیں ہوں گے؟"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا



ذاتی طور پر تم دعوت ضرور دے دینا۔"

وہ مسکراتی ہوئی بولی

"کہیں مجھے پٹوانے کی تدبیر سوچ رہے ہیں آپ؟ غضب خدا کا، میری جان پر بن جائے گی، کہیں گے فتنہ ہے آج آئی، اور آج ہی یہ کھڑاگ کھڑا کر دیا۔"

ڈاکٹر صاحب نے گھور کر تنویر کو دیکھا، اور چھیڑتے ہوئے کہا۔

"بزدل کہیں کی —"

وہ تن کر بولی۔

"بزدل تو ابھی نہیں ہوں، لیکن —؟"

"لیکن ویکن کچھ نہیں، جو کچھ میں نے کہا ہے، اس کی تعمیل فوراً کر ڈالو"

وہ اٹھتی ہوئی بولی۔

"ابھی گئی، لیکن نوشابہ کا سن کر کیا حال ہوگا؟"

"کیا حال ہوگا؟ — کیا وہ میری تجویز نامنظور کر دے گی —!"

"نامنظور کیسے کرے گی، لیکن چٹ منگنی پٹ بیاہ کا سن کر چکرا ضرور جائے گی —!"

"شہزادی کو ہمراز بنا لو، وہ بہت مدد کرے گی میرے خیال میں"

"نہیں یہ مصلحت کے خلاف ہے، اس کے کانوں میں بھنک پڑ گئی تو وہ ایک بوتل لڑکی ہے ضبط نہ کر سکے گی اور سارے گھر میں منع کرنے کے باوجود ادھم مچا دے گی، آخر اتنی پریشانیوں کے بیچ میں اکیلی کیا کروں گی؟"

"کرنا کیا ہے؟ — نوشابہ کی شادی کے سارے انتظامات حسینہ نے مکمل کر لئے تھے، کپڑے بھی موجود ہیں، زیور بھی، بس نہلا دھلا کر کوئی اچھا سا جوڑا پہنا دو، ایک آدھ زیور بھی، ویسے اسے زیوروں کا زیادہ شوق نہیں ہے، کمرہ میں رشیدہ بیگم نہ دیکھ سکیں، جب تک تم کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا اور وہ دلہن بن جائے گی۔"

یقین ہو گیا یہ تو بتلیے — میرا دل پریشان ہوا جا رہا ہے!"

تنویر نے وہ ساری داستان جو ڈاکٹر صاحب سے پوچھی کی پوری — کسی حد تک نمک مرچ لگا کر سنا دی اور کہا۔

"سن لیا؟"

یہ داستان نوشابہ نے سنی اور پھر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

تنویر نے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔

"یہ آنسو کیسے؟ — خوشی کے موقع پر یہ غم کیسا؟"

وہ بولی۔ "مجھے ابّی جان کی بے وقت موت پھر رُلا رہی ہے — ہائے ان کی قسمت میں زہر کی موت لکھی تھی۔"

تنویر نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا،

"بچی گیا ہوا وقت ملتا نہیں، ان کی موت اسی طرح لکھی تھی لیکن یہ موت شہادت کی ہوتی ہے وہ شہید ہو کر مرے۔ اس سے بڑھ کر عزت ایک مسلمان کے لیے کیا ہو سکتی ہے؟"

نوشابہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خاموش ہو گئی، بات سچی تھی لیکن غم اپنی جگہ مستقل تھا!

پھر وہ بولی، "یہ تو آپ نے سچ کہا لیکن سچی بات یہ ہے کہ زندگی بھر یہ حادثہ بھول نہ سکوں گی — کبھی نہیں کسی طرح بھی نہیں!"

تنویر نے تائید کی،

"ہاں وہ غم تو زندگی کا ساتھی بن گیا ہے —!"

# مسرت و الم

تنویر سراپا انبساط مسرت بنی نوشابہ کے کمرے میں پہنچی اور یہ دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں کہ اتنی ہی دیر میں اس کے مغموم افسردہ چہرے پر کتنی شادابی اور رعنائی آ گئی ہے۔

تنویر نے پہنچتے ہی اسے چھیڑتے ہوئے کہا

"آہا — بڑی خوش نظر آ رہی ہو اب تو!"

وہ ایک جاں نواز تبسم کے ساتھ گویا ہوئی،

"اور آپ؟ — آپ تو مجھ سے زیادہ خوش دکھائی دے رہی ہیں۔"

تنویر نے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا اور کہا،

"ہاں میری بچی! حمیدہ اور حسینہ کے مرنے کے بعد آج پہلی مرتبہ مجھے خوشی ہوئی ہے! کیا کہوں ان الفاظ میں کہوں کہ میرے دل کا کیا حال ہو رہا ہے مجھے کہیں شادیٔ مرگ نہ ہو جائے۔"

"ایسی باتیں نہ کیجیے — لیکن یہ کچھ پتہ چلا کہ ابا جان کی رائے میں دفعتہً ایسا اہم انقلاب کیسے آ گیا؟"

تنویر نے کہا، "ہاں کسی کی قسمت جب بگڑتی ہے، اور کسی کی قسمت جب سنورتی ہے تو دفعتاً ایسے ہی حالات رونما ہو جاتے ہیں جیسے اس وقت ہوئے ہیں —!"

## عید

تنویر اور نوشابہ میں باتیں ہو رہی تھیں، نوشابہ اپنے تاثراتِ الم بیان کر رہی تھی، اور تنویر تسکین اور دلدہی کی باتیں کر رہی تھی کہ یکایک ڈاکٹر صاحب آ گئے اور دروازہ ہی میں کھڑے ہو گئے اور کھنک کر تنویر سے کہنے لگے۔

"ارے تم اب تک یہیں بیٹھی ہو ـــ میں شاہد کو لینے جا رہا ہوں۔"

وہ بولی "جائیے آپ اپنا کام کیجئے، میں اپنا کام کر لوں گی۔"

ڈاکٹر صاحب نے جاتے ہوئے کہا۔

"بس ایک گھنٹہ کے اندر ہم لوگ آتے ہیں۔"

تنویر نے کہا، "بہت ہے ایک گھنٹہ!"

وہ چلے گئے، لیکن نوشابہ نے پوچھا،

"یہ ایک گھنٹہ کا معاملہ کیا ہے؟"

تنویر نے کہا "ایک گھنٹہ کا معاملہ کیا ہے یہ بتا دوں گی، تو پھر تم خوشی سے دیوانی ہو جاؤ گی!"

نوشابہ نے کہا "اتنے دنوں تک غم و الم کی زندگی بسر کرنے کے لئے اگر کوئی بات ایسی ہو سکتی ہے جو خوشی سے مجھے دیوانہ بنا دے تو ضرور سنائیے۔"

ان باتوں پر جن میں صداقت بھی تھی اور حسرت و سوز بھی، تنویر کا دل لرز اٹھا، اس نے کہا۔

"تو پھر اٹھو دلہن بن جاؤ جلدی سے!"

نوشابہ حیرت سے تنویر کی طرف دیکھنے لگی، تنویر نے کہا۔

"میاں صاحب آج ہی شاہد سے تمہاری شادی کر رہے ہیں، انھوں نے کہا ہے، نوشابہ کو دلہن بنا دو اور گھر میں اس وقت تک کسی کو پتہ نہ چلے، جب تک دولہا اور قاضی صاحب آ جائیں اس گھر میں!"

"اس وقت مذاق نہ کیا کیجئے!"

تنویر نے یقین دلاتے ہوئے کہا،

"تیرے سر کی قسم، اور جب تو دلہن بن جائے گی اور قاضی صاحب آ جائیں گے تب جا کر میں رشیدہ بیگم کو اس تقریبِ سعید میں شرکت کی دعوت دوں گا، خدا جانتا ہے مزا آ جائیگا، کھڑے سے گر پڑیں گی۔ واقعی یہ زہر ہلاہل ثابت ہوگا، ماں بیٹے کے لئے ـــ لیکن ہوا کرے!"

"لیکن تنہا چلیں گی!"

وہ بولی "جلد کریں ـــ لیکن وقت نہ ضائع کرو ـــ آؤ پہلے تمہیں نہلا دوں!"

نوشابہ نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی، البتہ یہ کہا،

"میں خود نہا لوں گی، آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں!"

تنویر نے کہا "تو پھر جلدی سے اتنے میں تمہارے کپڑے ٹھیک کرتی ہوں اور زیور منتخب کرتی ہوں ـــ کنگھی کہاں ہے!"

نوشابہ نے کوئی جواب نہیں دیا، مسکراتے ہوئے پرس سے کنگھی نکال کر تنویر کے سامنے پھینک دی، اور جب تک وہ نہا دھو کر آئے، تنویر نے ایک نہایت زرق برق جوڑا، جو مالیت کے اعتبار سے کسی طرح ہزار سے کم نہ ہوگا، انتخاب کر کے نکال لیا اور تین زیور بھی، حد درجہ سادہ لیکن بڑے قیمتی، اور جب وہ آئی تو اس نے بڑے چاؤ سے اس طرح جو ایک ماں کے دل میں اپنی لڑکی کے لئے ہو سکتا ہے، اسے نئے زیور میں واقعی

دلہن بنا دیا، پھر آئینہ سامنے لا کر دکھاتے ہوئے کہا۔

"پہچانتی ہو، یہ کون صاحبہ ہیں؟"

نوشابہ نے ایک ادا کے ساتھ آئینہ سامنے سے ہٹا دیا اور بولی۔

"خوب جانتی ہوں — چڑیل!"

تنویر بگڑ گئی "کیسی ری لڑکی مجھے چڑیل کہہ رہی ہے؟"

وہ ہنستی ہوئی گویا ہوئی "اپنے آپ کو — بھلا کوئی لڑکی دلہن بن کر بھی چڑیل کہہ سکتی ہے!"

اتنے میں معلوم ہی کہ ڈاکٹر صاحب شاہد کو لیکر آ گئے، اس کے کپڑوں پر سے وہ ایک اعلیٰ درجہ کا سوٹ وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے، راستے میں خرید لئے تھے، جب وہاں پہنچے تو تین دوستوں کو فون پر اس امر کی اطلاع دی تھی، وہ سب بھی موجود تھے، اور سب کے پاس اتنی مختصر مدت کے نوٹس پر کوئی تحفہ تھا، قاضی صاحب بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تھے۔

یہ سب لوگ ایک جلوس کی صورت میں ولا منزل پہنچے،

شروعات سے ان سب کی تواضع کی گئی، شاہد ڈاکٹر صاحب کی اس محبت پر حیران ہو رہا تھا، اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ محبتیں حمیدہ اور حسینہ کے ساتھ ختم ہو گئی تھی، وہ اب شکستہ ہو کر ڈاکٹر کی ذات میں سمٹ گئی تھیں وہ ان باتوں سے بے حد متاثر تھا۔

دفعتہً ڈاکٹر صاحب نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا۔

"یہ میری مرحوم بہن کا لڑکا اور مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے، اور اپنے اس وعدے کے ثبوت میں اپنی لڑکی نوشابہ کا عقد اس کے ساتھ کرتا ہوں!"

مبارکباد کا شور مچ گیا، قاضی صاحب آگے بڑھے اور انہوں نے باقاعدہ



طور پر رسم نکاح انجام دی،

اور جب قاضی صاحب گواہوں کے ساتھ ایجاب و قبول کیلئے تشریف لائے جب گھر والوں کو علم ہوا، شہزادی تو خوشی سے دیوانی ہو گئی، تنویر نے رشیدہ کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ جلدی چلئے، وہاں انتظار ہو رہا ہے!"

رشیدہ اب تک لاعلم تھی، اس نے پوچھا،

"کہاں چلوں؟ — کیوں انتظار ہو رہا ہے؟"

تنویر نے کہا "ارے آپ کو اب تک کی خبر تک نہیں؟"

وہ بولیں، کچھ متحیر ہو کر، کچھ پریشان ہو کر،

"مجھے تو خدا جانتا ہے، کچھ خبر نہیں!"

تنویر نے کہا، "آپ کی لڑکی نوشابہ کی شادی ہو رہی ہے!" قاضی صاحب تشریف لا چکے ہیں، باقی موجود ہیں، بس آپ کی کسر ہے!

رشیدہ پر بجلی گر پڑی، اس نے کہا۔

"نوشابہ کی شادی؟ ...... کس سے؟"

تنویر نے جواب دیا "شاہد کے سوا اور کس سے ہو سکتی ہے۔"

چہرہ کا رنگ اڑ گیا، زمین پاؤں تلے سے نکل گئی، آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا، چکر آنے لگا، کہنے لگیں،

"تم چلو میں آئی!"

اور تنویر کے جانے کے بعد کمرہ اندر سے بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔